گوشۂ کے این واصف

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان
اشاعت کا ۵۱ واں سال

حیدرآباد

مئی ۲۰۱۹

قیمت ۲۵ روپے

صدر بزم اتحاد جدہ محترم احمد الدین اویسی سالانہ جلسہ میں
’سالار ملت ادبی ایوارڈ ۲۰۱۹‘ مدیر شگوفہ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کو عطا کر رہے ہیں۔
بزم کے نائب صدر، معتمد عمومی، اراکین اور مہمان تصویر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال سالار ملت انعام جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے ۔۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

اشاعت کا ۵۱ واں سال

ماہنامہ

حیدرآباد

جلد ۵۲ — گوشۂ کے۔این۔ واصف — مئی ۲۰۱۹ — شمارہ ۵

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

قیمت فی پرچہ : ۲۵ روپے

زرسالانہ : ۴۰۰ روپے

کمپیوٹر کتابت: SAM کمپیوٹرس، مغل پورہ

9246 54 3027

شگوفہ انٹرنیٹ پر

www.shugoofa.com

لائبریریوں سے : ۶۰۰ روپے

بیرونی ممالک سے ۳۵ امریکن ڈالر

Shugoofa Monthly Vol.52 Issue.5 May 2019

Edited and Published by Syed Mustafa Kamal From H.No.10-4-771/82/A/1, Owaisi pura, Masab Tank, Hyderabad-500028. Printed at Daira Press 22-8-43, Chatta Bazar, Hyderabad-2.

Phone: Editor 09885202364, (Off) 040-24745716, (Res) 040-23326185.

سب آفس: 18 & 31 بچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد۔ 500001

E-mail: samurdu@yahoo.com

بزم اتحاد جدہ کا مشاعرہ بہ یاد سالار ملتؒ

مدیر شگوفہ کو سالار ملت ایوارڈ برائے ادبی خدمات عطا کیا گیا

جدہ ۔۲۰۔اپریل (ای میل) بزم اتحاد جدہ نے اپنا ساتواں سالانہ مشاعرہ بہ یاد سالار ملت اور سالار ملت ایوارڈ برائے ادبی خدمات ۲۰۱۹ کا جلسہ جدہ کی ہوٹل ہالی ڈے ان میں ۱۲، اپریل کو بڑے پیمانہ پر منعقد کیا۔مشاعرہ اور ادبی ایوارڈ کی صدارت بزم اتحاد کے صدر جناب احمد الدین اویسی نے کی اور اپنے صدارتی خطبہ میں انہوں نے بزم کی غرض و غایت حاضرین محفل کو بتائی۔ انہوں نے کہا کہ اس سال بہت ہی غور وخوص کے بعد سالار ملت ادبی ایوارڈ کے لیے حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی انتہائی حقدار و معتبر ہستی ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کو اس ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا۔ مصطفیٰ کمال پچاس سال سے زائد عرصے سے نہایت پابندی کے ساتھ شگوفہ شائع کر رہے ہیں اور اردو طنز و مزاح کے فروغ میں اہم حصہ ادا کر رہے ہیں۔

جلسہ کی کارروائی بزم کے جنرل سکریٹری و ترجمان جناب محمد یوسف الدین امجد نے بہت ہی عمدگی کے ساتھ چلائی۔ نائب صدر محمد عبید الرحمٰن نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ جناب اقبال اشہر، جناب اطہر شکیل، جناب احمد رئیس نظامی، جناب سردار اثر اور جناب مسعود حساس نے کلام سنایا۔ میزبان شعرا میں جناب مہتاب قدر، جناب ناصر برنی، جناب الطاف شہریار، جناب نعیم جاوید، جناب بدر الدین کامل، جناب افسر بارہ بنکوی، جناب فرحان عزیز، جناب اقبال بیلن نظام آبادی اور جناب محمد فرحت اللہ خاں شامل تھے۔ سردار اثر نے مشاعرے کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

بزم اتحاد جدہ نے ہر سال کی طرح اس سال بھی اپنے چنندہ ارکان کی پذیرائی کی اور سالار ملت ایکسلنس ایوارڈ کے لیے منتخب کیا۔ایوارڈ یافتگان میں عظمت علی عمران، محمد نصیر الدین، محمد افتخار، محمد خواجہ مظفر الدین اور اشفاق محی الدین شامل ہیں۔ جلسے کے آغاز پر حافظ و قاری محمد نعیم نے قرات سنائی۔ جدہ کے مشہور نعت خواں حافظ سید سلیم قادری نے نعت سنائی۔ بزم کے ممبر مرزا قدرت نواز بیگ نے اسپانسرز ، شعرائے کرام اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔اس مشاعرہ کی ٹائیٹل اسپانسر شپ کے لیے شاداں گروپ آف کالجس نے اپنا تعاون پیش کیا۔ دیگر اسپانسرز میں Chiko, Mamee, Vivo, Master Potato, Aljouf Travel and Tourism Agency, ASPRATECH Consultants, DPS School, Jeddah, Al Hijaz Al Madi Tour, Shadab Rest, Al Amoudi Travels Operator شامل ہیں۔

جناب احمد الدین اویسی صدر بزم اتحاد نے بزم اتحاد کے نائب صدر، معتمد عمومی ، اراکین اور مہمانوں کے ساتھ مصطفیٰ کمال کو سالار ملت ادبی ایوارڈ سے نوازا۔ جناب محمد یوسف الدین امجد معتمد عمومی نے سپاس نامہ پڑھا جس میں مصطفیٰ کمال کی اردو تحریک کے سپاہی اردو کے استاد اور شگوفہ کے مدیر کی حیثیت سے ٦٠ سالہ ادبی، صحافتی اور علمی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے اپنی تقریر میں سالار ملت صلاح الدین اویسی کے نام سے معنون انعام حاصل ہونے پر بے پایاں مسرت کا اظہار کیا اور بتایا کہ ان سے قربت کا انہیں شرف بھی حاصل رہا ہے۔۔

(پریس نوٹ : بزم اتحاد جدہ)

اس تھیلی کے چٹے بٹے
(فہرست)

روزنامہ جنگ کے کالم
روزنِ دیوار سے

عطاالحق قاسمی

غالب اور راجہ مہدی علی خان

مجھے اجازت دیں کہ میں آج ماہنامہ ’شگوفہ‘ حیدرآباد دکن کے ایڈیٹر ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کو مبارکباد کہوں کہ وہ آج کے دور میں طنز ومزاح پر مشتمل یہ جریدہ کئی عشروں سے پوری باقاعدگی اور معیار پر سمجھوتا کیے بغیر نکال رہے ہیں۔ ان دنوں طنز ومزاح لکھنے والے بہت کم رہ گئے ہیں۔ چنانچہ پاکستان میں طنز ومزاح کا جریدہ شائع کرنے کی بہت کوششیں ہوئیں مگر کچھ ہی عرصے بعد ان ’مہم جوؤں‘ کو توبہ تائب کرنا پڑی۔ البتہ میرے برادر بزرگ ضیا الحق قاسمی مرحوم ومغفور نے اپنا یہ مشن آخر دم تک جاری رکھا۔ میں ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کے علاوہ پیروڈی کے محقق ونقاد جناب فضل جاوید کو بھی سیلوٹ کرتا ہوں۔ جنہوں نے مزاح کی اس صنف پر گراں قدر کام کیا، چنانچہ ’شگوفہ‘ کا تازہ شمارہ فضل جاوید کی محنتوں اور کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ شگوفہ کے اس شمارے میں ممتاز شاعروں کی مشہور نظموں کی پیروڈی بھی نامور شاعروں نے کی ہے۔ ان پیروڈی نگاروں میں جوش ملیح آبادی، چراغ حسن حسرت، کنہیالال کپور، شوکت تھانوی، مجید لاہوری، دلاورفگار، سید محمد جعفری، علامہ حسین میر کاشمیری، ساجد مہدی علی خان، سید ضمیر جعفری، عاشق محمد غوری، اسلم عمادی اور دیگر نامور شعرا شامل ہیں۔ میں نے یہ پیروڈیز پڑھیں، سب کی سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں تاہم نمونے کے طور پر میں راجہ مہدی علی خان کی چند ایک پیروڈیز کی لذت میں اپنے قارئین کو شریک کررہا ہوں ملاحظہ فرمائیں:

غالب، ریستوران میں ایک اینگلوانڈین حسینہ کے ساتھ

ہے گال پہ اس تل کے سوا ایک نشاں اور
تم کچھ بھی کہو ہم کو گزرتا ہے گماں اور

تم کہتی ہو انگلش میں محبت کا کرو بات
آتی نہیں اردو کے سوا مجھ کو زباں اور

سعدی کی زباں ہی میں کچھ ارشاد کروں میں
ڈر ہے کہ یہ گزرے نہ کہیں تجھ کو گراں اور

یارب یہ نہ سمجھی ہے نہ سمجھے گی مری بات
ملک اور دے اس کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

کب سے ہم ادھر بیٹھا ہے اے بوائے ادھر آؤ
لیمن کے سوا بھی ہے کوئی چیز یہاں اور

لے آؤ وہ شے جلدی سے اب ورنہ یہ سن لو
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

گر حکم ہو میڈم تو میں منگواؤں مٹن چاپ
کہہ دینا اگر چاہیے دل اور زباں اور

دل اور زباں کرلا فرائی ارے بیرا
دل اور دے اس کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

☆......○......☆

تقی الدین میر (ریاض، سعودی عرب)

ذکرِ یاراں کی رسم اجراء تقریب، ڈاکٹر حفظ الرحمٰن اعظمی کا خطاب

کے این واصف سرکردہ اور کہنہ مشق صحافی ہیں۔ حیدرآباد کے روزنامہ سیاست کے مستقل کالم نگار ہیں۔ سعودی عرب میں غیر مقیم ہندستانیوں کی سرگرمیوں، انھیں درپیش مسائل پر سیاست میں اپنے ہفتہ واری کالم میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ قیام سعودی عرب کے دوران کے این واصف نے متعدد شخصیات پر مختلف موقعوں پر خاکے لکھے۔ ''ذکر یاراں'' کے نام سے خاکوں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ چند ہفتے قبل اس کی رسم اجرائی مقامی ہوٹل میں عمل میں آئی۔ کے این واصف کے ہمدرد دیرینہ بزنس مین ڈاکٹر سید مسعود نے اپنے ادارے کے زیر اہتمام متذکرہ کتاب کی اشاعت عمل میں لائی۔ ہندستانی بزم اردو نے تقریب اجرائی کا اہتمام کیا۔ فرسٹ سکریٹری سفارت خانہ ہند ریاض و نامزد سفیر شام برائے ہند ڈاکٹر حفظ الرحمٰن اعظمی نے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور رسم اجرا انجام دی۔ ڈاکٹر حفظ الرحمٰن اعظمی نے تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کے این واصف بہ حیثیت فری لانس جرنلسٹ مختلف اردو اخبارات کے لئے خبریں، مضامین اور کالم لکھتے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کسی انسان کا اپنی زبان کی خدمت، بقا اور ترویج کے لئے وقت نکالنے والے کو ہم مجاہد اردو ہی کہہ سکتے ہیں اسی طرح کے این واصف مجاہد اردو قرار پاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ کے این واصف سے ۲۰۰۵ سے واقف ہیں۔ جب وہ انڈین کونسلیٹ جدہ میں متعین تھے کے این واصف نے کونسلیٹ کے زیر اہتمام منعقدہ ایک ماہ طویل انڈیا فیسٹیول میں حصہ لیا تھا اور ہندوستان کی تاریخی عمارتوں کی تصاویر پر مشتمل پراجیکٹ کو اس فیسٹیول میں پیش کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ کے این واصف جتنی اچھی فوٹوگرافی کرتے ہیں اتنا ہی اچھا لکھتے بھی ہیں چاہے وہ رپورٹنگ ہو، کالم ہو یا مضامین یا پھر خاکہ نگاری ہر صنف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں وہ اپنی تحریروں کو بے جھول تنقید سے پاک رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر حفظ الرحمٰن اعظمی نے ہندستانی بزم اردو کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ یہ بزم اردو کی ترقی و ترویج اور بقا میں بہترین خدمات انجام دے رہی ہے۔

اس موقع پر ہندستانی کمیونٹی کی معروف شخصیت ڈاکٹر عزیر غازی، صحافی غوث ارسلان، محمد مظفر احمد نے کے این واصف کی شخصیت اور فن پر مضامین پڑھے۔ صحافی محمد سیف الدین نے مزاحیہ خاکہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ پرنسپل انڈین انٹرنیشنل اسکول ڈاکٹر شوکت پرویز، انجینئر سہیل احمد سابق صدر امویا، انجینئر محمد مبین صدر عثمانیہ یونیورسٹی المنائی اسوسی ایشن، نیاز احمد صدر بہار فاونڈیشن، آفتاب احمد نظامی صدر جامعہ ملیہ المنائی اسوسی ایشن، ڈاکٹر اشرف علی صدر آل انڈیا یونائیٹڈ سوسائٹی، محمد عبدالجبار صدر تلنگانہ این آر آئیز اسوسی ایشن، محمد مطیب صدر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اولڈ بوائز اسوسی ایشن نے بھی اظہار خیال کیا۔ صدر ہندستانی بزم اردو ریاض تقی الدین میر نے ابتدا میں مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور بزم کی سرگرمیوں سے واقف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ کے این واصف بزم کے بانیان میں شامل ہیں۔ رسم اجرا کی تقریب کی خاص بات یہ رہی کہ محفل میں شریک پرستاران اردو نے کتاب بہ ادائیگی قیمت حاصل کی۔ شائد ریاض میں یہ پہلا موقع تھا کہ حاضرین میں سے کسی شخص نے کتاب مفت حاصل نہیں کی۔ اردو کے حلقہ میں طرز کہن کے بیچ یہ رسم نو تھی۔ صدر بزم محمد تقی الدین اور نائب صدر محمد شہباز فاروقی نے کے این واصف کو مومنٹو پیش کئے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر اشرف، خالد عبدالکریم، حافظ علیم الدین، عبدالقدوس جاوید اور سید عتیق وغیرہ نے گلدستے اور شال پیش کئے۔ محفل کی ابتدا حافظ و قاری عبدالواسع جاوید کی قرأت کلام پاک سے ہوئی۔ نظامت کے فرائض صدر تنظیم ہم ہندوستانی محمد قیصر نے انجام دئے۔ محمد قیصر نے اپنے ابتدائی کلمات کے بعد فن خاکہ نگاری پر روشنی ڈالی۔ تقریب کا اختتام شہباز فاروقی کے ہدیہ تشکر پر ہوا۔

ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک

اُردو خاکے کے اولیں نقوش

ویسے تو دنیا کی کسی بھی زبان یا ادبی صنف کے نقطۂ آغاز کا تعین کرنا خاصا مشکل کام ہے اس سلسلے میں عام طور پر قیاس آرائی ہی کو راہبر تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی اردو انشائیے کی مبادیات سے متعلق یہ رائے مزے دار ہونے کے ساتھ ساتھ مبنی بر حقیقت بھی ہے۔ وہ اردو انشائیے کے آغاز و اولیت کے سلسلے میں ہونے والی طویل بحث میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے، آدم کے حوّا سے اظہار محبت کو دنیا کا پہلا انشائیہ قرار دینے کے بعد لکھتے ہیں:

''دنیا کا دوسرا انشائی ادب پارہ بھی خوش قسمتی سے حضرت آدم ہی کے حصے میں آیا۔ قابیل اور ہابیل کے اختلاف نے قابیل کو کامیابی سے ہم کنار کیا اور ہابیل کو گور سے۔ اس فعل پر آدم مرثیہ خواں ہوئے اور انشائی ادب کا دوسرا نمونہ عالمِ وجود میں آیا۔ بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ یہ ادب پارہ منظوم تھا لیکن میری دانست میں یہ منثور تھا۔ مجھے اپنی بات پر اس لیے بھی اصرار ہے کہ اپنی بات نہ وہ بزرگ ثابت کر سکتے ہیں نہ میں۔'' (الف)

عام خیال یہی ہے کہ اردو ادب میں خاکے کا ڈول میرزا فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۴ء۔۱۹۴۷ء) نے ''ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی...... کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' (مرقومہ: ۱۹۲۷ء) کے ذریعے ڈالا۔ کوئی بہت دور کی کوڑی لایا تو اس صنف کے ڈانڈے مولانا محمد حسین آزاد (۱۸۳۰ء۔۱۹۱۰ء) کی ''آبِ حیات' میں کیے گئے شعرا کے لطیف تذکروں سے ملا دیے۔ جہاں تک اردو میں خود نوشت خاکے کا تعلق ہے، یہ تو خالصتاً موجودہ دور کی لن ترانی ہے۔ اس کے قدموں کے نشاں تو شاہد احمد دہلوی اور سعادت حسن منٹو سے آگے جاتے دکھائی نہیں دیتے۔

لیکن میرزا اسداللہ خاں غالب کی نثری و شعری تحریروں کے بالاستعیاب مطالعے کے بعد ہم نے برملا اعلان کیا تھا کہ ان سطور میں سے غالب کا ایک شوخ و شنگ خاکہ جھانکتا دکھائی دیتا ہے۔ ذیل کی تحریر اپنے اسی دعوے کی تصدیق کے طور پر پیش کی جا رہی ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ پوری کی پوری تحریر کا مزاج اور اسلوب جدید خاکے سے لگا کھاتا ہے۔ اس میں ایک ایک جملہ بلکہ ایک ایک لفظ غالب کا اپنا تحریر کردہ ہے۔ ہم نے محض ان جملوں، شعروں اور اقتباسات کو اپنے فہم کے مطابق ترتیب دے دیا ہے۔ اب اگر اس تحریر میں آپ کو خاکے کا رنگ ڈھنگ اور ذائقہ محسوس ہونے لگے تو اس دعوے کو تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں کہ اردو ادب میں خاکے کا سنگ بنیاد بھی میرزا غالب ہی کے ہاتھوں رکھا گیا۔ پھر اس بات کو مان لینے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ جہاں سے اردو خاکے کی ابتدا ہو رہی ہے، وہیں سے اردو میں خود نوشت خاکے کا ابتدائی سرا بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ آیئے آپ کو خاکہ نگار غالبؔ سے متعارف کرواتے ہیں۔

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے (۱)

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے
دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے (۲)

میں ترک قوم کا سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماورالنہر سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ

میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا، وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر عرف میرزا دولہ لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔(۳) پانچ برس کی میری عمر تھی کہ مہاراجا بختاور سنگھ بہادر کی رفاقت میں مارا گیا۔ سرکار سے میرے باپ کی تنخواہ میرے نام پر جاری ہوئی اور ایک گاؤں جس کا تالڑا نام ہے، مجھ کو برائے دوام ملا۔ آپ یوں سمجھیے کہ ادھر دودھ پینا چھوڑا اور راج کی روٹی کھائی۔(۴) نصراللہ بیگ خاں بہادر میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا، اس نے مجھے پالا...... بمرگ ناگاہ مر گیا، رسالہ برطرف ہو گیا، ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی......۱۸۳۰ء میں کلکتے گیا۔ نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی، سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید، یہ تین رقم خلعت ملا،(۵) عمر بھر نوکری کی تو بہادر شاہ سے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب پایا کچھ دنوں بادشاہ کا مصاحب رہا پھر استاد کہلایا...... دنیا دار نہیں فقیر ہوں بہت سی عزت اور تھوڑی سی دولت چاہتا ہوں۔(۶) مکان گھر کا نہیں، کرائے کی حویلی میں رہتا ہوں۔(۷)

میں ایک شخص گوشہ نشیں، فلک زدہ، اندوہ گیں، نہ اہل دنیا، نہ اہل دیں(۸) ایک سپاہی زادہ ہیچ مداں اور دل افسردہ و رواں فرسودہ۔ ہاں، ایک طبع موزوں اور فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں۔(۹) ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا...... پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر میں آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔(۱۰) نہ سفیہہ ہوں کہ ہجو میں سخن سرائی کروں، نہ فقیہہ ہوں کہ بحث میں زور آزمائی کروں۔ غریب الوطن سپاہی زادہ ہوں، فلک زدۂ خانماں بہ باد دادہ ہوں۔ تابِ آفتابِ حوادث سے ظل اللہ کے سایۂ دیوار کی پناہ میں بیٹھا ہوں، گویا ایک ہوا مسافر ہوں کہ آرام کی جگہ دیکھ کر دم لینے کو راہ میں بیٹھا ہوں۔(۱۱) میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے...... جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں، مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزری؟ بقول شیخ علی حزیں:

تا دستر سم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی(۱۲) نہ آزاد ہوں، نہ مقید، نہ رنجور ہوں، نہ تندرست، نہ خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جیے جاتا ہوں، باتیں کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں...... نہ شکر ہے نہ شکایت ہے، جو تقریر ہے، بہ سبیل حکایت ہے۔(۱۳) دنیا دار نہیں، مکار نہیں، خوشامد میرا شعار نہیں، جس میں جو صفات دیکھتا ہوں، وہ بیان کرتا ہوں(۱۴) فقیر میں جہاں اور عیب ہیں، ایک یہ بھی عیب ہے کہ جھوٹ نہیں بولتا۔(۱۵) حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے۔(۱۶) بارہ برس کی عمر سے نظم و نثر میں کاغذ مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں......اور کی فیض رسانی اور قدر دانی کو کیا روئیں؟ اپنی تکمیل ہی کی فرصت نہیں۔(۱۷) اپنا نام بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے۔(۱۸) خاکسار نے ابتدأ سنِ میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔ پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر فارسی کا عاشق اور مائل ہوں، ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا، فارسی زبان میں بہت کچھ بکا۔ اب نہ فارسی کا فکر، نہ اردو کا ذکر۔(۱۹) افسوس کہ میرا حال

اور یہ لیل و نہار، آپ کی نظر میں نہیں، ورنہ آپ جانیں کہ اس بجھے ہوئے دل اور اس ٹوٹے ہوئے دل اور اس مرے ہوئے دل پر کیا کر رہا ہوں۔ اب نہ دل میں وہ طاقت، نہ قلم میں زور، سخن گستری کا ایک ملکہ باقی ہے، بے تأمل اور بے فکر جو خیال میں آ جائے، وہ لکھ لوں ورنہ فکر کی صعوبت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔(۲۰)

میرا قصد سیاحت کا ہے پنسن اگر کھل جائے گا تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا، وہاں رہ گیا، جہاں سے دل اکھڑا، چل دیا...... عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹئی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، بھٹئی متروک۔ نہ غزل، نہ مدح، ہزل و ہجو میرا آئین نہیں...... بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف و جوانب سے اشعار آ جاتے ہیں۔ اصلاح پاتے ہیں۔(۲۱) خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں۔ بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے، ایک دو صبح کو، ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔(۲۲) جس طرح امرا واسطے فقرا کے وجہء معاش مقرر کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اس سرکار (سرکار رام پور) سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دعائے خیر اور مجھ سے اصلاحِ نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلی رہوں، چاہوں اکبر آباد، چاہوں لاہور، چاہوں لوہارو۔ ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کروں۔ کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھروں، آٹھ کہار ٹھیکے کے لوں۔ چار آدمی رکھتا ہوں۔ دو یہاں چھوڑوں، دو ساتھ لوں، چل دوں...... گاڑی ہو سکتی ہے، شراب مل سکتی ہے، کہار بہم پہنچ سکتے ہیں، طاقت کہاں سے لاؤں؟(۲۳)

میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا، صرف سخن فہم رہ گیا ہوں، بناوٹ نہ سمجھنا، شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا ہے۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے کیونکر کہا تھا۔(۲۴) پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔ اب جسم و جاں میں تاب و تواں نہیں۔(۲۵) خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک جوتی اور لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔(۲۶) ناسازیٔ روزگار و بے ربطیٔ اطوار، بطریق داغ بالائے داغ، آرزوئے دیدار۔ وہ دو آتش شرارہ بار اور یہ ایک دریائے ناپیدا کنار، وقِنا رّبنا عذاب النّار(۲۷)

لو اب میری کہانی سنو، میری سرگزشت میری زبانی سنو(۲۸) میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض...... کولبرک صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے۔ میرا حق دلانے پر، ریذیڈنٹ معزول ہو گئے، سکرتر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے۔ بعد اک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینا مقرر کیا، ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال، ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔(۲۹)

میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا...... میری نحوست طالع کی تاثیر تھی، میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے، واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے، جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے، وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔(۳۰) دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی، سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کُش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ اب میں جو والیٔ دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والیٔ شہر

مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں۔(۳۱)

میری جان! غالب کثیر المطالب کی کہانی سن(۳۲) عالم دو ہیں: ایک عالم ارواح اور ایک عالمِ آب وگل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے، جو خود فرماتا ہے۔لمن الملک الیوم اور پھر آپ جواب دیتا ہے۔للہ الواحد القہار۔ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ آب وگل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوامِ حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔فکر نظم و نثر کو مشقّت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانہ سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے۔ پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پانو بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار، مشقّت مقرری اور مشکل ہوگئی، طاقت یک قلم زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں، سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ء میں چھوٹ جاؤں۔(۳۳)

میرا دکھ سنو! ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک تنہائی سے نفور، ایک کو تنہائی منظور ہے...... خدا نے لاولد رکھا تھا، شکر بجالاتا تھا۔ خدا نے میرا شکر مقبول ومنظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے، یعنی جس لوہے کا طوق اسی لوہے کی دو ہتکڑیاں(۳۴) بھی پڑ گئیں۔ خیر اس کا کیا رونا ہے، یہ تو قید جاودانی......احتمال تعیش و تنعم بشرط تجرید۔(۳۵) میرا حقیقی بھائی گُل ایک تھا، وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا...... بھائی، مجھ میں اب کچھ باقی نہیں۔ برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔(۳۶) زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آ رہے ہیں۔(۳۷) اور دم بہ دم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمّل کرتا ہوں۔(۳۸) میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے؟ بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غم فراق، غم رزق، غم عزت۔(۳۹) ہزار ہا دوست مر گئے، کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں؟ جیوں تو کوئی غم خوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں۔(۴۰) سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔(۴۱) آپ جانتے ہیں کہ کمال یاس مقتضئ استغنا ہے، پس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بہ امید مرگ جیتا ہوں۔(۴۲) حکام بے پروا، مختار عدیم الفرصت، میں پا شکستہ۔(۴۳)

اب اپنا خاص دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی دو بچے، تین چار آدمی گھر کے، کلّو، کلیان، ایاز، یہ باہر مداری کی جورو بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے، میاں گھمن گئے، گئے مہینا بھر سے آ گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ایک پیسے کی آمد نہیں، بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے۔(۴۴) وہ بقدر سدّ رمق ہے۔محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی آتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں، بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں؟ بڑھاپا، ضعف قویٰ، اب مجھ کو دیکھو تو جانو میرا کیا رنگ ہے؟...... وہ عرق، جو بقدرِ طاقت، بنائے رکھتا تھا، اب میسر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار

میں جاتا تھا، خلعت فاخرہ پاتا تھا، وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں، نہ مردود ہوں، نہ بے گناہ ہوں، نہ گناہ گار ہوں، نہ مخبر، نہ مفسد۔(۴۵)

جاڑا پڑ رہا ہے، تو انگر غرور سے، مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔ آب کاری کے بندوبستِ جدید نے مارا، عرق کے نہ کھینچنے کی قیدِ شدید نے مارا۔ ادھر انسداد دروازۂ آب کاری ہے، ادھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔(۴۶) بیس برس آگے یہ بات تھی کہ ابرو باراں میں یا پیش از طعام یا قریبِ شام تین گلاس پی لیتا تھا اور شرابِ شبانہ معمولی (مراد ہے معمول کی۔ مرتب) میں مجرا نہ لیتا تھا۔ اس بیس برس میں بیس برساتیں ہوئیں۔ بڑے بڑے مینھ برسے، پینا ایک طرف، دل میں خیال بھی نہ گزرا۔(۴۷)

گرمی میں میرا حال بعینہ وہی ہوتا ہے، جیسے پانی پینے والے جانوروں کا۔(۴۸) کیوں کر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں؟ ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ کیا ہوش مندی ہے کہ قبلہ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم(۴۹) میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔(۵۰) میں تو اقلیم سخن کا گدائے خاک نشیں ہوں۔(۵۱) نظم ونثر کے قلم رو کا انتظام ایزد دانا وتوانا کی عنایت واعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام ونشان باقی وقائم رہے گا۔(۵۲) میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ ما نہیں آیا، بھیک ما آیا۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت، میری اور منعم کی ہمت(۵۳) تحریر کا تارک نہیں بلکہ متروک ہوں...... رام پور کے سفر میں تاب و طاقت، حسنِ فکر، لطفِ طبیعت یہ سب اسباب لٹ گیا...... جب تک زندہ ہوں، غمزدہ و افسردہ، ناتوان و نیم جاں ہوں۔ جب مرجاؤں گا تو میرے مرنے کی خبر سن لو گے۔ پس جب تک میرے مرنے کی خبر نہ سنو، جانو کہ غالب جیتا ہے، خستہ ونژند، رنجور و دردمند۔(۵۴)

خدا کی بندہ نوازیاں ہیں کہ مجھ ننگِ آفرینش کو اپنے خاصانِ درگاہ سے بھلا کہواتا ہے۔ ظاہرا میرے مقدر میں یہ سعادتِ عظمیٰ تھی کہ میں اس وبائے عام میں جیتا بچ رہا۔ اللہ اللہ ایسے کشتنی و سوختنی کو یوں بچایا اور پھر اس رتبہ کو پہنچایا۔ کبھی عرش کو اپنا نشیمن قرار دیتا ہوں اور کبھی بہشت کو اپنا پائیں باغ تصور کرتا ہوں۔(۵۵) وبا تھی کہاں، جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ؟ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت، ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تف بریں وبا!(۵۶)

۱۸۵۶ء سے بموجب تحریر وزیر، عطیہ شاہی کا امیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں اگر گنہ گار ہوں۔ گنہ گار ٹھہرتا، گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں۔ مقید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔(۵۷) غدر میں میرا گھر نہیں لٹا مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا؟

ہاں! بھائی ضیاء الدین خاں صاحب، ہندی اور فارسی نظم اور نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے، سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا، پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟(۵۸) منھ پیٹتا ہوں اور سر پٹکتا ہوں کہ جو لکھنا چاہتا ہوں، نہیں لکھ سکتا۔(۵۹) میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا۔ خواہ اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر، شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی، ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی؟ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔

سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یاز دہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔(۶۰) میں مع زن وفرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔(۶۱)

غدر کے دنوں میں، میں نہ شہر سے نکلا، نہ پکڑا گیا، نہ میری روبکاری ہوئی۔ جس مکان میں رہتا تھا وہیں بدستور بیٹھا رہا۔ بلی ماروں کے محلے میں میرا گھر تھا۔ ناگاہ ایک دن آٹھ سات گورے دیوار پر چڑھ کے اس خاص کوچے میں اتر آئے، جہاں میں رہتا تھا۔ اس کوچے میں بہ ہمہ جہت پچاس یا ساٹھ آدمی کی بستی ہوگی۔ سب کو گھیر لیا اور ساتھ لے چلے۔ راہ میں سارجن (سارجنٹ) بھی آ ملا۔ اس نے مجھ سے صاحب سلامت کے بعد پوچھا کہ تم مسلمان ہو؟

میں نے کہا: ''آدھا مسلمان''

اس نے کہا: ''ول صاحب! آدھا مسلمان کیسا؟''

میں نے کہا: ''شراب پیتا ہوں، ہیم (خوک) نہیں کھاتا''(۶۲)

اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں: میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں، بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد، تینوں مردود ومطرود، محروم ومغموم:

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام وسبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے (۶۳)

میں دنیا داری کے لباس میں فقیری کر رہا ہوں، لیکن فقیر آزاد ہوں، نہ شیاّد، نہ کیاّد۔ ستر برس کی عمر ہے، بے مبالغہ کہتا ہوں ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے زمرۂ خاص میں سے، عوام کا شمار نہیں...... میں آدمی نہیں آدم شناس ہوں:

نگہم نقب ہے زد بہ نہاں خانۂ دل
مژدہ باد اہل ریا را کہ زمیداں رفتم (۶۴)

مَیں عربی کا عالم نہیں مگر نرا جاہل بھی نہیں، بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں۔ علما سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلب گار رہتا ہوں، فارسی میں مبدأ فیاض سے مجھے وہ دست گاہ ملی ہے اور اس زبان کے قواعد وضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں، جیسے فولاد میں جوہر۔ اہل پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں: ایک تو یہ کہ ان کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان، دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے، سو دو سو، چار سو، آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے۔(۶۵) وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے، مرزا رحیم الدین بہادر حیاتخلص کے دیوان کے دیباچہ کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوانِ حافظ، موجب فرمائش جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے، اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے...... اس سے زیادہ بھٹئی میری روش نہیں۔(۶۶)

پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزار ہا خط اطراف وجوانب سے آتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ محلۂ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکاّم کے خطوط فارسی وانگریزی، یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام...... اگر میں تمھارے نزدیک امیر نہیں نہ سہی، اہلِ حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلّہ اور تھانہ نہ لکھا جائے ہرکارہ میرا پتہ نہ پائے۔ آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے، خط پہنچنے کا میں ضامن۔(۶۷)

ایک لطیفہ نشاط انگیز سنیے، ڈاک کا ہرکارہ جو بلّی ماروں کے خطوط پہنچاتا ہے، ان دنوں میں ایک بنیا پڑھا لکھا، حرف شناس، کوئی فلاں ناتھ، ڈھمک داس ہے۔ میں بالا خانہ میں رہتا ہوں۔ حویلی میں آکر اس نے داروغہ کو خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو، آپ کو جیسا

کہ دلّی کے بادشاہ نے ''نوابی'' کا خطاب دیا تھا اب کالپی سے خطاب نی کا ملا۔ حیران کہ یہ کیا کہتا ہے؟ سرنامہ غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم ''مخدوم نیاز کیشاں'' لکھا تھا، اس قرّمساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کرکے ''کیشاں'' کو'' ن'' پڑھا۔'' (۶۸)

سچ تو یہ ہے کہ...... مولانا غالب علیہ الرحمتہ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستانِ خیال کی آ گئی۔ سترہ بوتلیں بادہ ناب کی توشک خانہ میں موجودہ ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں، رات بھر شراب پیا کرتے ہیں؟

کسے کیں مرادش میسر بود
اگر جم نہ باشد سکندر بود(۶۹)

سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو...... بھئی ''مغلچے'' بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی ''مغلچہ'' ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے، کیسی اشک افشانی؟ کہاں کی مرثیہ خوانی؟ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی؟ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ! چشمِ بددور، وہی ایک حور(۷۰)

یہ تمھارا دعا گو اگرچہ اور امور میں پایہ عالی نہیں رکھتا مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے یعنی بہت محتاج ہوں(۷۱) اگر میری اوقات شبانہ روزی اور میرے حالات آپ دیکھیں تو تعجب کریں گے کہ یہ شخص جیتا کیوں کر ہے؟(۷۲) بے تکلف عرض کرتا ہوں، اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔(۷۳) بائیس مہینے سے وہ رزق کہ جو مقوم جسم اور مفرح روح تھا، مسدود ہے۔ (۷۴) بائیس مہینے کے بعد پرسوں کوتوال کا حکم آیا ہے کہ اسد اللہ خاں پنسن دار کی کیفیت لکھو کہ وہ بے مقدور اور محتاج ہے یا نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطے کے مجھ سے چار گواہ مانگے...... سو...... خزانے سے روپیہ آ گیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آ گئی، دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا، ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دارو گیر سے بچنا کرامت اسد اللہی ہے، ان پیسوں کا ہاتھ آنا عطیہ یداللہی ہے۔(۷۵)

میں موحدِ خالص اور مومنِ کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ، لاموثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں...... ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہو گا، بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوتِ مصطفویؐ و امامت مرتضویؑ اس میں جلیں......(۷۶)

بادشاہ سے کیا عجب ہے کہ دو برس کی تنخواہ دے کر مجھ کو خانۂ خدا کے طواف کی رخصت دیں کہ یہ گنہگار وہاں جاوے اور اگر زیست ہے تو وہاں جا کر اور اپنے ستاون برس کے گناہ کہ جس میں سوائے شرک کے سب کچھ ہے، بخشوا کر پھر آوے۔(۷۷)

میں اگلے زمانے کا آدمی ہوں، جہاں ایک امر کی ابتدا

دیکھی، یہ جان لیا کہ اب یہ امر مطابق اس ہدایت کے نہایت پذیر ہوگا۔(۷۸) نہ ہٹ دھرم ہوں، نہ مجھے اپنی بات کی پچ ہے...... علم و ہنر سے عاری ہوں، لیکن پچپن برس سے محو سخن گزاری ہوں۔ مبداء فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے، ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں، مطابق اہل پارس کے منطق کا بھی مزا ابدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد، تربیت استاد سے حسن و قبح ترکیب پہچاننے لگا، فارسی کے غوامض جاننے لگا۔

بعد اپنی تکمیل کے تلامذہ کی تہذیب کا خیال آیا۔ ''قاطع برہان'' کا لکھنا کیا تھا گویا باسی کڑھی میں ابال آیا۔ لکھنا کیا تھا کہ سہام ملامت کا ہدف ہوا۔ ہے ہے یہ تنک مایہ معارض اکابر سلف ہوا۔(۷۹)

فقیر شکوے سے برا نہیں مانتا، مگر شکوے کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منھ نہ موڑے اور معہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجایش نہ چھوڑے۔(۸۰)

ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا کہ قبلہ آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے:

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر! شاباش، رحمت خدا کی

میں نے یہی ان سے کہا تھا کہ اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ بات یہ ہے کہ ایک شخص میرا امانی اسد ہو گزرے ہیں۔ یہ غزل ان کے کلام معجز نظام میں سے ہے اور تذکروں میں مرقوم ہے۔ میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے، ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔ تم طرز تحریر اور روش فکر پر بھی نظر نہیں کرتے۔ میرا کلام اور ایسا مزخرف!(۸۱) میرا ہم قوم تو سراسر قلمرو ہند میں نہیں۔ سمرقند میں دو چار یادداشتِ خنچاق (۸۲) میں سو دو سو ہوں گے، مگر ہاں اقربائے سبھی ہیں۔ سو پانچ برس کی عمر سے ان کے دام میں اسیر ہوں، اکسٹھ برس ستم اٹھائے ہیں، دریا سارا تیر چکا ہوں، ساحل نزدیک ہے، دو ہاتھ لگائے، بیڑا پار ہے۔(۸۳)

وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہ بھی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا بڑا، وبا کیوں نہ ہو؟ ''لسان الغیب'' نے دس برس پہلے فرمایا تھا؟

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔ بعدِ رفعِ فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔(۸۴)

فقیر میں تین عیب ہیں: ستر برس کی عمر، کانوں سے بہرا، ہمیشہ بیمار ہے، آمد ورفت دوام میں قاصر(۸۵) ہجومِ غم سے فراغ نہیں۔ اگر چہ گوشۂ نشین و خانماں خراب ہوں، لیکن حسب رابطۂ ازلی کثیر الاحباب ہوں...... اگر جوان ہوتا تو احباب سے دعائے صحت کا طلب گار ہوتا، اب جو بوڑھا ہوں تو دعائے مغفرت کا خواہاں ہوں۔(۸۶) اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہیں سکتا اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر، چار پایہ بن کر اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔(۸۷) ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی، گرانی۔ رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے، زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے، دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے (۸۸)

''ستر ا بہترا'' اردو میں ترجمہ پیر ''خرف'' ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے، پس میں ''اخرف'' ہوا، گویا حافظہ کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا، رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی طرح معدوم ہو گیا۔(۸۹) پھوڑوں سے بدن لالہ زار، پوست سے

ہڈیاں نمودار۔ پھوڑے ایسے جیسے انگارے سلگتے ہیں۔ اعضا پر دس جگہ پھائے لگتے ہیں۔ ضعف و ناتوانی علاوہ، سوز غم ہائے نہانی علاوہ...... سوائے شہرتِ خشک کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔ ''احسنت'' و''مرحبا'' کا شور سامعہ فرسا ہوا۔ خیر، ستایش کا حق ستایش سے ادا ہوا۔(۹۰) مبالغہ نہ سمجھو، میں ایک قالب بے روح ہوں:

یکے مردہ شخصم بمردی رواں

اضمحلال روح کا روز افزوں ہے۔ صبح کو تبرید، قریب دو پہر کے روٹی، شام کو شراب۔ اگر اس میں سے جس دن ایک چیز اپنے وقت پر نہ ملی، میں مر گیا۔ واللہ...... میں لم یلد ولم یوُلد ہوں۔(۹۱) ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں۔ آپ غم زدہ اور آپ غمگسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پر کھڑا ہے، پا بہ رکاب ہوں۔(۹۲) کھچڑی کھائی دن بہلائے، کپڑے پھاڑے گھر کو آئے۔(۹۳) آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ سترھواں برس مجھے جاتا ہے، ہائے:

سنینِ عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس (۹۴)

میں زندہ ہوں لیکن نیم مردہ۔ آٹھ پہر پڑا رہتا ہوں۔ اصل صاحب فراش میں ہوں۔ بیس دن سے پانو پر ورم ہو گیا ہے۔ کفِ پا و پشتِ پا سے نوبت گزر کر پنڈلی تک آماس ہے۔ جوتے میں پاؤں سماتا نہیں۔ بول و براز کے واسطے اٹھنا دشوار۔ یہ سب باتیں ایک طرف، دردِ محللِ روح ہے۔ ۱۲۷۷ء میں میرا نہ مرنا، صرف میری تکذیب کے واسطے تھا، مگر اس تین برس میں ہر روز مرگ نو کا مزا چکھتا رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں، پھر میں کیوں جیتا ہوں؟ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے، جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت۔(۹۵) پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرہ، ضعفِ بصارت، ضعفِ دماغ، ضعفِ دل، ضعفِ معدہ، ان سب ضعفوں پر ضعفِ طالع۔(۹۶)

میں اموات میں ہوں، مردہ شعر کیا کہے گا؟ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں، جو غزل کی روشِ ضمیر میں آوے؟ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟ ہائے انوری گویا میری زبان سے کہتا ہے:

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوار مدیح
اے دریغا نیست معشوقے سزاوار غزل (۹۷)

مشہور ہے یہ بات کہ جو کوئی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے۔ موتی کی روح کو اس کی بوُ پہنچتی ہے۔ ایسے ہی میں سونگھ لیتا ہوں غذا کو۔ پہلے مقدار غذا کی تولوں پر منحصر تھی، اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی اب دنوں پر ہے۔(۹۸) ایک شعر میں نے بہت دن سے کہہ رکھا ہے۔ اس خیال سے کہ میرے بعد کوئی میرا دوست مرثیہ لکھے تو اس شعر کو بند قرار دے کر ترکیب بند رقم کرے۔ وہ شعر یہ ہے:

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خاں غالب مُرد(۹۹)

بہتر برس کا آدمی، پھر رنجور دائمی، غذا یک قلم مفقود...... نہ روٹی، نہ بوٹی، نہ پلاؤ، نہ خشکا۔ آنکھ کی بینائی میں فرق، ہاتھ کی گیرائی میں فرق، رعشہ مستولی، حافظہ معدوم (۱۰۰) خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار (۱۰۱) قریبِ مرگ ہوں۔ غذا بالکل مفقود اور امراض مستولی۔ بہتر برس کی عمر۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (۱۰۲)

سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو مرنے کے بعد جنت آرام گاہ، عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں۔ چونکہ یہ اپنے آپ کو شہنشاہِ قلمرو سخن جانتا تھا۔ ''سقر مقر'' اور ''زاویہ ہاویہ'' خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ ''آیئے نجم الدولہ بہادر'' ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں:

اجی حضرت نواب صاحب!

نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب!

آپ سلجوقی وافراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہورہی ہے؟ کچھ تو بولو، کچھ تو اُکسو''؟

بولے کیا؟ بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی تو سونچا ہوتا کہ کہاں سے دوں گا؟(۱۰۳)

درویش دل ریش وفرماندۂ کشاکش، معاصی کے خاتمہ بخیر ہونے کی دعا مانگیں، اللہ بس ماسویٰ ہوس۔(۱۰۴) زیادہ کیا لکھوں؟ (۱۰۵)

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے (۱۰۶)

......☆......

حواشی

نوٹ: اس خاکے میں تمام نثری حوالے''خطوط غالب'' مرتبہ: غلام رسول مہر مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۶۸ء (چہارم اشاعت) سے لیے گئے ہیں۔

الف: ڈاکٹر وحید قریشی، اردو کا بہترین انشائی ادب، مکتبہ میری لائبریری لاہور، ۱۹۸۸ء،ص۱۱۔

۱ مرزا اسد اللہ خان غالب کی رنگا رنگ نظم ونثر جہاں ادبی دنیا کے جملہ معیارات اپنے اندر سموئے ہوے ہے وہاں وہ ان کمالات کی بھی حامل ہے کہ اس میں انیسویں صدی کی دہلوی تہذیب، برصغیر کی سیاسی و معاشرتی زندگی کے نشیب و فراز اور سب سے بڑھ کے خود مرزا غالب کی سیماب صفت شخصیت کی روشن و متحرک تصویریں آنکھوں کے راستے دل کے س پہ مرتسم ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ راقم نے اپنے پی ایچ۔ڈی کے مقالے کے خاکہ نگاروں کے باب میں آزاد یا فرحت اللہ بیگ کی بجائے مرزا غالب کو اردو کا اولیں خاکہ نگار قرار دیا تھا۔ یہ خاکہ اپنے اسی دعوے کے ثبوت کے طور پر مرتب کیا گیا ہے، جس کا عنوان بھی غالب ہی کے ایک مصرع پر مشتمل ہے: پورا شعر اس طرح ہے:

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

دیوان غالب، مرتبہ: نور الحسن نقوی، المسلم پبلشرز کراچی، ۱۹۸۹ء، ص۱۸۲

۲ ایضاً، ص:۱۶۶

۳ مکتوب نمبر۱۲ بنام: میر حبیب اللہ ذکا مشمولہ''خطوط غالب'' مرتبہ غلام رسول مہر، ص۳۹۳

۴ مکتوب نمبر۱ بنام: میر بندہ علی خاں، ص۵۳۵

۵ مکتوب نمبر۱۲ بنام: میر حبیب اللہ ذکا، ص۳۹۳۔۳۹۴

۶ مکتوب نمبر۱ بنام: میر بندہ علی خاں، ص۵۳۵

۷ مکتوب نمبر۱۰۹ بنام: مرزا ہرگوپال تفتہ، ص۱۷۰

۸ مکتوب نمبر۱ بنام: سخاوت حسین، ص۵۳۸

۹ مکتوب نمبر۵ بنام: چودھری عبدالغفور سرؔور، ص۳۹۹

۱۰ مکتوب نمبر۶ بنام: عبدالرزاق شاکر، ص۴۵۴

۱۱ تقریظ برکتاب بہادر شاہ ثانی مشمولہ''خطوط غالب''، ص۵۷۰

۱۲ مکتوب نمبر۱۷ بنام: مرزا حاتم علی بیگ مہر، ص۱۹۴

۱۳ مکتوب نمبر۶۱ بنام: مرزا ہرگوپال تفتہ، ص۱۴۶

۱۴ مکتوب نمبر۱ بنام: حکیم غلام رضا خاں، ص۵۳۲

۱۵ مکتوب نمبر۲ بنام: مولوی نعمان احمد، ص۵۱۹

۱۶ مکتوب نمبر۳ بنام: میاں داد خاں سیاح، ص۳۶۵

۱۷ مکتوب نمبر۱ بنام: میر غلام حسنین قدر بلگرامی، ص۴۶۰

۱۸ مکتوب نمبر۴۹ بنام: علاؤالدین علائی، ص۸۸

۱۹ مکتوب نمبر۱ بنام: عبدالغفور خاں نساخ، ص۴۸۴

۲۰ مکتوب نمبر۵ بنام: انورالدولہ شفق، ص۳۰۰

۲۱ مکتوب نمبر۳۰۳ بنام: علاؤالدین علائی، ص۵۱

۲۲ مکتوب نمبر۶۲ بنام: مرزا ہرگوپال تفتہ، ص۱۴۶

۲۳ مکتوب نمبر۱۰ بنام: علاؤالدین علائی، ص ۵۸
۲۴ مکتوب نمبر۳۴ بنام: مرزا ہرگوپال تفتہ، ص ۱۲۶
۲۵ مکتوب نمبر۱ بنام: میر غلام حسنین قدر بلگرامی، ص ۴۶۰
۲۶ مکتوب نمبر۱ بنام: مرزا قربان علی بیگ سالک، ص ۹۶
۲۷ مکتوب نمبر۴۴ بنام: علاؤالدین علائی، ص ۸۴
۲۸ مکتوب نمبر۹ بنام: میر مہدی مجروح، ص ۲۳۲
۲۹ مکتوب نمبر۱۶ بنام: چودھری عبدالغفور سرور، ص ۴۱۵۔۴۱۶
۳۰ مکتوب نمبر۶ بنام: علاؤالدین علائی، ص ۵۲۔۵۳
۳۱ مکتوب نمبر۱۶ بنام: چودھری عبدالغفور سرور، ص ۴۱۵۔۴۱۶
۳۲ مکتوب نمبر۳۷ بنام: علاؤالدین علائی، ص ۸۰
۳۳ مکتوب نمبر۹ بنام: علاؤالدین علائی، ص ۵۵
۳۴ غالب نے متعدد مقامات پر بیگم کو بیڑی اور طوق جبکہ زین العابدین عارفؔ کے دونوں بچوں کو ہتکڑیاں قرار دیا ہے، یہاں غالب کا مطلوب یہ ہے کہ جس خاندان سے بیوی کا تعلق تھا، ان لے پالک بچوں کی نسبت بھی اسی خاندان سے ہے۔
۳۵ مکتوب نمبر۶ بنام: حکیم غلام نجف خاں، ص ۳۱۶۔۳۱۷
۳۶ مکتوب نمبر۹۵ بنام: مرزا ہرگوپال تفتہ، ص ۱۶۳۔۱۶۴
۳۷ ''پاس آرہے ہیں'' سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی آنے والے ہیں لیکن یہاں ''آرہے ہیں'' کا مفہوم یہ ہے کہ آ کر رہ رہے ہیں، اگلے جملے سے مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔
۳۸ مکتوب نمبر۷ بنام: مرزا ہرگوپال تفتہ، ص ۱۰۸
۳۹ مکتوب نمبر۷ بنام: نواب یوسف مرزا، ص ۳۴۲
۴۰ مکتوب نمبر۱ بنام: مرزا حاتم علی بیگ مہر، ص ۱۸۰
۴۱ مکتوب نمبر۳۴ بنام: میاں داد خاں سیاح، ص ۲۸۲
۴۲ مکتوب نمبر۴ بنام: خواجہ غلام غوث خاں بے خبر، ص ۲۷۲
۴۳ مکتوب نمبر۴ بنام: نواب حسین مرزا، ص ۳۳۳
۴۴ رام پور سے ملنے والے وظیفے کی طرف اشارہ ہے۔
۴۵ مکتوب نمبر۷ بنام: نواب یوسف مرزا، ص ۳۴۳
۴۶ مکتوب نمبر۱۴ بنام: حکیم غلام نجف خاں، ص ۳۲۱
۴۷ مکتوب نمبر۹۹ بنام: مرزا ہرگوپال تفتہ، ص ۱۶۵۔۱۶۶
۴۸ مکتوب نمبر۱۲ بنام: انورالدولہ شفق، ص ۳۰۶
۴۹ مکتوب نمبر۲ بنام: انورالدولہ شفق، ص ۲۹۷
۵۰ مکتوب نمبر۱۱ بنام: مرزا حاتم علی بیگ مہر، ص ۱۸۷
۵۱ مکتوب نمبر۱ بنام: سید محمد زکریا خاں زکی دہلوی، ص ۵۱۴
۵۲ مکتوب نمبر۲ بنام: عبدالرزاق شاکر، ص ۴۵۱
۵۳ مکتوب نمبر۱۱۹ بنام: مرزا ہرگوپال تفتہ، ص ۱۷۶
۵۴ مکتوب نمبر۲ بنام: مرزا شمشاد علی بیگ رضوان، ص ۹۸
۵۵ مکتوب نمبر۴ بنام: صاحب عالم مارہروی، ص ۴۳۱
۵۶ مکتوب نمبر۳۷ بنام: میر مہدی مجروح، ص ۲۵۶
۵۷ مکتوب نمبر۵ بنام: خواجہ غلام غوث خاں بے خبر، ص ۲۷۴
۵۸ مکتوب نمبر۳ بنام: مرزا یوسف علی خاں عزیز، ص ۴۸۸
۵۹ مکتوب نمبر۸ بنام: انورالدولہ شفق، ص ۳۰۱
۶۰ مکتوب نمبر۲۸ بنام: مرزا ہرگوپال تفتہ، ص ۱۲۳
۶۱ مکتوب نمبر۱۸ بنام: چودھری عبدالغفور سرور، ص ۴۱۸
۶۲ ''غدر'' سے متعلق غالب کی ایک تحریر مشمولہ ''خطوطِ غالب''، ص ۵۸۲۔۵۸۳
۶۳ مکتوب نمبر۲۱ بنام: میر مہدی مجروحؔ، ص ۲۴۳
۶۴ مکتوب نمبر۱۱ بنام: غلام غوث خاں بے خبر، ص ۲۸۰
۶۵ مکتوب نمبر۹۴ بنام: منشی ہرگوپال تفتہ، ص ۱۶۲۔۱۶۳
۶۶ مکتوب نمبر۱ بنام: منشی ہرگوپال تفتہ، ص ۱۰۲
۶۷ مکتوب نمبر۶ بنام: علاؤالدین علائی، ص ۵۳
۶۸ مکتوب نمبر۱۴ بنام: انورالدولہ شفق، ص ۳۰۷
۶۹ مکتوب نمبر۳۳۔۳۴ بنام: میر مہدی مجروح، ص ۲۵۲۔۲۵۳
۷۰ مکتوب نمبر۱۹۔۲۰ بنام: مرزا حاتم علی بیگ مہر، ص ۱۹۶۔۱۹۷
۷۱ مکتوب نمبر۱۶ بنام: منشی ہرگوپال تفتہ، ص ۱۱۴

۷۲ مکتوب نمبر ۳ بنام: نواب میر غلام بابا خاں، ص ۳۵۱
۷۳ مکتوب نمبر ۷ا بنام: چودھری عبدالغفور سرور، ص ۴۱۷
۷۴ مکتوب نمبر ۸ بنام: چودھری عبدالغفور سرور، ص ۴۰۷
۷۵ مکتوبات نمبر ۱۰، ۲۶ بنام: میر مہدی مجروح، ص ۲۳۴، ۲۴۷
۷۶ مکتوب نمبر ۲۳ بنام: علاؤالدین علائی، ص ۷۱
۷۷ دیباچہ، سراج المعرفت مئولفہ سید رحمت اللہ خاں بہادر، مشمولہ خطوطِ غالب، ص ۵۶۷
۷۸ مکتوب نمبر ۳۷ بنام: علاؤالدین علائی، ص ۸۰
۷۹ مکتوب نمبر ۱ بنام: مفتی سید محمد عباس، ص ۴۸۲-۴۸۳
۸۰ مکتوب نمبر ۲ بنام: مرزا حاتم علی بیگ مہر، ص ۱۸۱
۸۱ مکتوب نمبر ۲۰ بنام: منشی شیونرائن آرام، ص ۲۱۳
۸۲ قپچاق، ترکستان کی ایک صحرا نشین قوم کا نام، وہ جس علاقے میں قیام پذیر تھی، اسے دشتِ قپچاق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
۸۳ مکتوب نمبر ۷ا بنام: انورالدولہ شفق، ص ۳۰۹-۳۱۰
۸۴ مکتوب نمبر ۳۶ بنام: میر مہدی مجروح، ص ۲۵۴
۸۵ مکتوب نمبر ۵ بنام: پیارے لال آشوب، ص ۵۸۴
۸۶ مکتوب نمبر ۱ بنام: نامعلوم، ص ۵۴۵
۸۷ مکتوب نمبر ۱۰ بنام: میر حبیب اللہ ذکاء، ص ۳۹۱
۸۸ مکتوب نمبر ۴ بنام: میاں داد خاں سیاح، ص ۳۶۶
۸۹ مکتوب نمبر ۱۲ بنام: میر حبیب اللہ ذکا، ص ۳۹۳
۹۰ مکتوب نمبر ۲ بنام: میر حبیب اللہ ذکا، ص ۳۸۵
۹۱ مکتوب نمبر ۱ بنام: نواب امین الدین احمد خاں، ص ۴۴
۹۲ مکتوب نمبر ۵ بنام: قاضی عبدالجمیل جنوں، ص ۴۳۸-۴۳۹
۹۳ مکتوب نمبر ۱۲۰ بنام: منشی ہرگوپال تفتہ، ص ۱۷۶
۹۴ مکتوب نمبر ۱ بنام: صفیر بلگرامی، ص ۵۲۷

یاد رہے کہ مرزا غالب کے اس شعر کے جواب میں صفیر بلگرامی نے ایک قطعہ کہا تھا کہ:

سنا صفیر، یہ کہتے ہیں حضرت غالب
بہت جیوں تو جیوں اور پانچ چار برس
مگر یہ پہلے سے امدادِ غین کی ہے دعا
خدا کرے مرا غالب جیے ہزار برس

۹۵ مکتوب نمبر ۱۶ بنام: قاضی عبدالجمیل جنوں، ص ۴۴۲
۹۶ مکتوب نمبر ۷ بنام: نواب میر غلام بابا خاں، ص ۳۵۳
۹۷ مکتوب نمبر ۱۳ بنام: چودھری عبدالغفور سرور، ص ۴۱۳
۹۸ مکتوب نمبر ۱۵ بنام: میر حبیب اللہ ذکا، ص ۳۹۵
۹۹ مکتوب نمبر ۱ بنام: سید مقبول عالم، ص ۴۳۵
۱۰۰ مکتوب نمبر ۹ بنام: حکیم سید احمد حسن مودودی، ص ۳۶۱
۱۰۱ مکتوب نمبر ۴۵ بنام: علاؤالدین علائی، ص ۸۵
۱۰۲ مکتوب نمبر ۱۳ بنام: میر حبیب اللہ ذکا، ص ۳۹۴
۱۰۳ مکتوب نمبر ۱ بنام: مرزا قربان علی بیگ خاں سالک، ص ۹۶
۱۰۴ مکتوب نمبر ۲ بنام: عبدالرزاق شاکر، ص ۴۵۱
۱۰۵ مکتوب نمبر ۲ بنام: نواب یوسف مرزا، ص ۳۳۸
۱۰۶ دیوان غالب مرتبہ: نورالحسن نقوی، ص ۱۴۸

ashfaqvirk@fccollege.edu.pk

☆......○......☆

پرچہ ڈاک سے وصول نہ ہو تو پوسٹ کارڈ پر اطلاع دیجیے۔ اسٹاک میں موجود ہو تو دوبارہ ارسال کیا جائے گا۔ (ادارہ)

ڈاکٹر فیاض احمد فیضی
ممبئی

یہ اُن دنوں کی بات ہے

مجھے اچھی طرح یاد ہے میں جب پہلی مرتبہ پروفیسر عبدالستار دلوی سے ملا تھا تو 1965ء کے اپریل کا آخری ہفتہ تھا اور اس وقت اُن کی عمر بمشکل 28 برس کی تھی۔ تین برس پہلے وہ محمد حسین آزاد پر پی ایچ ڈی کر چکے تھے۔ ایم اے کے امتحانات میں یونیورسٹی کے تمام طلبہ سے زیادہ نمبر حاصل کر کے گورنر کے ہاتھوں چانسلر میڈل حاصل کر چکے تھے اور اس سے قبل بی اے اُردو میں اوّل پوزیشن حاصل کر کے سینٹ زیویئرس گولڈ میڈل کے علاوہ اپنے کالج کی بابرکت ہم سفر میمونہ کے ساتھ رشتہ مناکحت میں بندھ کر رفیق حیات کے حق دار بھی ہو چکے تھے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہندوستانی فوجیں پاکستانی فوجوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں لوہا لے رہی تھیں، اُدھر اپنی کم گوئی کے لیے مشہور ڈاکٹر دلوی اپنی زُبان کے سارے حقوق بیگم کے آگے Surrender کر کے خود Linguistics (لسانیات) میں پی ایچ ڈی (دوّم) کی تیاریوں میں لگے تھے۔

آپ یقیناً یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اس وقت راقم السطور کی عمر اور مصروفیت کیا تھی؟ اب آپ سے کیا پردہ مجھے یہ بتاتے ہوئے کوئی عار نہیں کہ مستقبل کا یہ مزاح نگار اُس وقت اپنی کتابوں کی دکان کے باہر فٹ پاتھ پر بچوں کے ساتھ کنچے (Marble) کھیل رہا تھا اور اس وقت اس کی عمر گیارہ سال تھی۔ دلوی صاحب نے مربیانہ سرزنش کے بعد مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اس کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے بشرطیکہ میں اپنی تفریح کے لیے کسی بہتر کھیل اور جگہ کا انتخاب کرلوں۔ اپنے اس وعدے پر وہ آج تک قائم ہیں۔ ویسے اس زمانے میں مسلمان بچوں کا یہ مرغوب کھیل تھا۔ ابھی موبائیل کی پیدائش میں 30 برس باقی تھے۔ اسی روز مجھے دلوی صاحب سے پتہ چلا کہ گیارہ برس کی عمر بہت اہم ہوتی ہے اور اُردو کا ہر بڑا شاعر اس عمر تک پہنچتے پہنچتے شعر کہنے لگتا ہے اور یہ کہ اُردو میں ہر شاعر، دوسرے تمام شاعروں سے بڑا ہوتا ہے۔ خود علامہ اقبالؔ نے گیارہ برس کی عمر میں

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

جیسا شعر کہہ کر ساری اُردو دُنیا کو حیران کر دیا تھا۔ دلوی صاحب نے یہ کہہ کر مجھے مزید حیران کر دیا کہ مراٹھی کے لوگ شاعری کرنے میں اتنی عجلت نہیں برتتے مگر نثر لکھنے میں کمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے بتایا کہ مشہور مقبول ڈرامائی شخصیت وجے تندولکر نے بھی گیارہ برس کی عمر میں اپنا پہلا ڈرامانہ صرف لکھا بلکہ اسے ڈائرکٹ بھی کیا اور اس میں اداکاری بھی کی۔ وجے تندولکر اور ڈاکٹر عبدالستار دلوی سے یہ میرا پہلا تعارف تھا ورنہ 1938ء میں انتقال کرنے والے علامہ اقبالؔ تو لب پہ آتی ہے دُعا بن کے میری، سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا اور آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ کے سبب روزانہ ہمارے گھر تشریف لاتے تھے۔۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے، جب بیسوی صدی کی چوتھی دہائی میں دابھیل، رتنا گیری، مہاراشٹر میں بہترین قسم کے رسیلے اور میٹھے آموں کی جائے پیدائش تھا۔ یہ وہ آم تھے جو مرزا غالبؔ کو بھی میسر نہ تھے اور انہیں بادشاہ کے باغوں میں اُگنے والے لنگڑے لُولے آموں سے کام چلانا پڑتا تھا۔ ایسے ہی میٹھے اور

بے ضرر پھلوں کے درمیان 18 راگست 1937ء کوعبدالستار نامی بچے کا جنم ہوا مگر ان کے والدین نے سرکاری ریکارڈ میں یکم ستمبر 1937ء کی تاریخ پیدائش درج کرائی تا کہ اکیسویں صدی میں اُردو کے ریسرچ اسکالر برسر روز گار بنے رہیں۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ اُردو کے ہر بڑے شاعر اور ادیب کی ایک سے زیادہ تاریخ ہائے پیدائش ہوتی ہیں۔ یہ بچہ بہت کم روتا تھا اور زیادہ تر اپنا انگوٹھا ہونٹوں سے لگائے سوچتا رہتا تھا۔ پس والدین سمجھ گئے کہ یہ بڑا ہوکر شاعر کم اور ادیب زیادہ بنے گا۔تنقید کم اور تحقیق زیادہ کرے گا۔ چوڑی پیشانی والے اس نیک بخت بچے کی پیدائش کے ایک سال کے اندر اندر سعودی عرب میں تیل نکل آیا اور ہندوستانی مسلمان بچوں نے جلدی جلدی دوڑتے بھاگتے اپنی تعلیم مکمل کر کے سعودی عرب میں اونچی تنخواہ والی ملازمتوں کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا لیکن خاک نشینی میں اعتماد رکھنے والے ڈاکٹر دلوی کی نگاہیں کہیں اور تھیں۔انہیں اپنا وطن عزیز تھا۔اپنی زبان پیاری تھی۔انہوں نے اُردو میڈیم میں احمد سیلر ہائی اسکول ممبئی سے ایس ایس سی کرنے کے بعد اسماعیل یوسف کالج جوگیشوری میں داخلہ لیا جہاں کے ہل اسٹیشن جیسے رومانی ماحول میں طلبہ تفریح زیادہ اور پڑھائی کم کرتے تھے۔اس بات کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا کہ نوجوان عبدالستار دلوی نے وہاں پڑھائی زیادہ کی یا کچھ اور مگر ان کے بی اے فرسٹ کلاس فرسٹ اور فرسٹ اینڈ لاسٹ نکاح نامے دونوں پر سنہ 1958ء درج ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے اپنی دوسری پی ایچ ڈی، لسانیات کے موضوع پر 1967ء میں مکمل کی اور مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر میں بحیثیت ڈائرکٹر منتخب کر لیے گئے ۔ یہ وہی سال تھا جب مراٹھی کے مشہور ڈراما نویس شری وجے تندولکر کا شہرۂ آفاق ڈراما ''خاموش ! عدالت جاری ہے۔'' پہلی مرتبہ اسٹیج پر پیش کیا گیا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ 1967ء میں ہونے والے ان دونوں واقعات کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ جواباً عرض ہے کہ تاریخ ہو یا تمثیل ، غیر متعلق کردار اور واقعات اسی طرح خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں اور ایک دن سینٹر اسٹیج پر آپس میں گلے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے ،خوبرو اور بردبار ڈاکٹر عبدالستار دلوی کو جوانی کے دنوں میں جو بھی دیکھتا تھا یہی سمجھتا تھا کہ فلم اداکار بسواجیت نے عینک لگا لی ہے۔ڈاکٹر دلوی کی گفتگو سے دور اور اداکاری سے بہت دور ہوتی تھی اور وہ مرد و زن دونوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ بسواجیت بھی نوجوان لڑکے لڑکیوں کے چہیتے تھے اور اداکاری انہیں بھی بالکل نہیں آتی تھی۔ دلوی صاحب کی آواز فلم اسٹار راجندر کمار کی طرح قدرے مہین تھی۔ اور جس طرح راجندر کمار کی ہر فلم سلور جبلی ہٹ ہوتی تھی ، ڈاکٹر دلوی بھی اپنے ہر امتحان میں ،اپنی ہر ادبی کاوش میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر دلوی دھیمی آواز میں دلنشین گفتگو کے سبب پہچانے جاتے تھے ، جس طرح دلیپ کمار اپنی دل کو چھونے والی فلمی گفتگو رُک رُک کر، آہستہ آہستہ، رومانی لہجے میں کرنے کے لیے مشہور تھے۔ البتہ دلیپ کمار کے ریکارڈ کے بالکل برخلاف دلوی صاحب ، رومانس اور عاشقی سے ہمیشہ چار ہاتھ دور رہے اور 1958ء میں اپنی شادی کے بعد کبھی مڑ کر کسی کتابی چہرے کو بغور نہیں دیکھا اور ہر قسم کی نئی اور پرانی ، دبلی اور ضخیم کتابوں کے لیے اپنی زندگی وقف کردی ۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے ساٹھ برسوں سے ہمیشہ اُن کے ہونٹوں پر بچوں جیسی معصوم مسکراہٹ اور آنکھوں میں اداسی صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کے بیضوی چہرے کا ٹھیک ایک تہائی حصہ چوڑی پیشانی نے گھرا ہوا ہے ۔جس پر ہلکی اور متوازی تین لکیریں نوشتہ تقدیر کی صورت غور سے دیکھنے پر نظر آجاتی ہیں۔ البتہ جب وہ کسی بات پر ناراض ہوتے ہیں تو یہ لکیریں مارے خوف کے غائب ہوجاتی ہیں۔ پیشانی کی ناکہ بندی کرتی ہوئی اور ذہین آنکھوں کے لیے راستہ بناتی ہوئی ، مشہور اور ممتاز انسانوں والی اونچی ناک جس کی اونچائی قائم رکھنے کی خاطر انہیں ہمیشہ سخت محنت میں مبتلا رہنا پڑتا

ہے۔ ناک اور چہرے کے تناسب کی سلامتی کے لیے پھولے ہوئے گالوں کا قدرتی عطیہ انہیں ملا ہے، جن کی دوطرفہ پہرے داری کرتے ہوئے لمبے کان خود اپنے مالک کے ہزاروں لیکچر سُن سُن کر علم کی کھان بن گئے ہیں۔

یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب ممبئی کی اُردو اسامیوں اور عہدوں پر شمالی ہند کے لوگوں کا قبضہ تھا جو اہل زبان ہونے کے سبب مقامی اُردو والوں، خصوصاً مراٹھی بولنے والوں کو اپنے سے کم تر سمجھ کر خوش ہوتے تھے۔ شمالی اور مشرقی ہند کے مسلمان جو اب ممبئی نواسی تھے، اپنے بچوں کو اس خوف سے مراٹھی نہیں پڑھانا چاہتے تھے کہ ان کی اپنی پیاری زبان بگڑ جائے گی اور بچے دین سے دور ہو جائیں گے۔ اُدھر اُن کے بچے ممبئی کی ببیا زبان جو مراٹھی، گجراتی، ہندی، پرتگالی اور نہ جانے کن کن زبانوں اور بولیوں کا ملغوبہ ہے، بولنا سیکھ رہے تھے اور اچھی اور شستہ اُردو سے دور ہوتے جارہے تھے۔ ایسے میں ڈاکٹر دلوی کی ادبی پیش رفت کو یہ اہل زبان نگاہِ غلط انداز سے یوں دیکھتے تھے جیسے وہ ان کی خیالی محبوبہ کو ہتھیا کر لیے جارہے ہوں۔ ڈاکٹر دلوی نے گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر میں تقریباً سولہ برس خدمات انجام دیں اور اس عرصہ میں وہاں تحقیقی کاموں کے علاوہ ایک عظیم الشان لائبریری بھی قایم کردی، جہاں 35 ہزار کم یاب و نایاب کتابوں کا ذخیرہ ہوگیا۔ اس کے علاوہ ''ہندوستانی زبان'' نامی تحقیقی رسالے کا اجرا بھی کیا۔ جو بیک وقت ہندی/ اُردو میں شایع ہوتا ہے، اور اس کے دو انتہائی اہم نمبر امیر خسرو نمبر اور سورداس نمبر بھی شایع کیے۔

اس درمیان 1975ء میں پہلی بار مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکادیمی قائم ہوئی۔ وہاں بھی ڈاکٹر رفیق زکریا، کرشن چندر، سردار جعفری، سکندر علی وجد اور خواجہ عبدالغفور کے ساتھ ڈاکٹر عبدالستار دلوی کو بھی اس میں جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ ظاہر ہے یہ بات بھی سینکڑوں ادیبوں، شاعروں اور اُردو کے بہی خواہوں کو بالکل پسند نہیں آئی اور دلوی صاحب کو ناپسند کرنے والوں کی تعداد مسلسل بڑھتی رہی۔ اس کے باوجود اُردو اکادیمی کی کرسی نے انہیں بارہ برس تک اپنے سے جُدا کرنا گوارا نہیں کیا۔ ان بارہ برسوں میں دلوی مخالفین میں بڑے ناموں کا اضافہ ہوتا رہا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اب ان مخالفین میں یوپی، بہار کے لوگوں کے علاوہ مہاراشٹر کے مقامی یعنی کوکنی ادیب، شاعر اور پروفیسر بھی شامل ہوگئے تھے۔

ڈاکٹر دلوی ناراض رہنے والے اُردو کے دو پروفیسر حضرات، کالج کی تعطیلات کے دوران، باقاعدگی سے ہماری کتابوں کی دکان پر آیا کرتے تھے اور وہاں بیٹھ کر گھنٹوں تعلیمی غیبت کیا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی ان کا محبوب موضوع ہوا کرتے تھے۔ میں نے اپنے جاتے ہوئے بچپن اور آتی ہوئی جوانی کا بیشتر حصہ ایسی علمی گفتگو سنتے ہوئے گذارا۔ ان میں سے ایک پروفیسر جو میرے ہم وطن بھی تھے، کلاس کے اندر اور باہر اپنی استہزائیہ جملے بازی کے لیے مشہور تھے۔ میں نے انہیں جب سنا کسی نہ کسی کا مذاق اڑاتے ہی سنا۔ انہیں ہر لفظ کے معنی بزعم خود زبانی یاد تھے۔ ایک مرتبہ میری کلاس میں ہی کسی نے ان سے 'قدمچہ' کے معنی پوچھ لیے۔ وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکے، پھر فوراً انہوں نے معنی بتا دیئے۔ ''چھوٹا قدم'' کلاس کے بہت سے لڑکے ہنس دیئے کیوں کہ قدمچہ کا تعلق بیت الخلا سے ہوتا ہے جس کی تعمیر اور پبلسٹی ہمارے ملک میں آج کل زور وشور سے ہو رہی ہے۔

جب میں ایم اے میں پہنچا تو وہاں بھی وہی جملے باز استاد موجود تھے۔ وہاں ان کے پڑھانے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ کسی طالب علم کو وہ سوال پوچھنے کا موقع دیتے تھے نہ اجازت۔ پہلے وہ موضوع کا اعلان کرتے، مثلاً خطوط نگاری، پھر ہر طالب علم سے خطوط نگاری کی تعریف دریافت کرتے اور ہر ایک کے جواب کے دوران کوئی نہ کوئی جملہ کستے جاتے۔ آخری طالب علم کا نمبر آتے آتے پیریڈ ختم ہوجاتا اور وہ مسکراتے ہوئے رخصت ہوجاتے۔ افسوس کئی برس ہوئے ان کا انتقال ہوگیا۔ آج کے دور

میں اگر وہ زندہ ہوتے تو اپنی جملے بازی اور تعلیمی لیاقت کی بنا پر پرائم منسٹر بھی ہو سکتے تھے!

1983ء میں بمبئی یونیورسٹی میں کرشن چندر چیئر قایم ہوئی تو اس کے امیدوار کے لیے مراٹھی جاننا ضروری قرار دیا گیا۔ اس شرط کی بدولت نہایت آسانی سے ڈاکٹر دلوی کو دوسرے امیدواروں پر فوقیت حاصل ہوگئی اور ان پر یہ الزام لگ گیا کہ مراٹھی کی شرط ان ہی کی کوششوں سے لگائی گئی تھی۔

یہ اِن دنوں کی بات ہے جب بمبئی میں تعلیم کا بڑا بول بالا تھا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کیے بغیر ڈگری حاصل کرنے کی خاطر کیا جوان کیا ادھیڑ عمر، یونیورسٹی کے علاوہ پی ایچ ڈی کے کارخانے تک جانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان دنوں بمبئی میں پی ایچ ڈی بنانے کے تین کارخانے کھل گئے تھے۔ ایک وی ٹی ٹرمنس پر جو اب چھترپتی شیواجی مہاراج ٹرمنس کہلاتا ہے۔ دوسرا سانتا کروز ایئر پورٹ کے قریب اور تیسرا بمبئی کے مضافات تھانے میں جہاں ہر سال خوش حال کند ذہن طلبہ کو مناسب معاوضہ پر ڈاکٹر بنایا جاتا تھا۔ تھوک میں پی ایچ ڈی تھیسس لکھی جانے کے سبب ان میں کچھ انوکھی چیزیں بھی شامل ہوجاتی تھیں۔ جیسے مسز مرزا غالب کا نام امراؤ بیگم کی جگہ امراؤ جان ادا لکھ دیا گیا۔ جس پر گائیڈ کی نظر بھی نہیں پڑی۔ عام طور پر ایسی تھیسس کا آغاز کسی بڑے ادیب کے اقتباس یعنی Quotation سے ہوتا تھا اور اقتباسات کے سہارے ہی بڑھتی ہوئی اس کا اختتام بھی اقتباس پر ہی ہوتا تھا۔ مجھے خود ایک مرتبہ پی ایچ ڈی گائیڈ نے بتایا کہ ان کی ایک شاگردہ کسی کارخانے میں تیارشدہ پی ایچ ڈی تھیسس ان کے پاس لے کر آئی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ خود ان کا ایک مطبوعہ مضمون ایک پورے باب کی شکل میں تھیسس کی زینت بنا ہوا تھا، جس کی خبر خود اس طالبہ کو بھی نہیں تھی!

ایسے علمی ماحول میں ڈاکٹر دلوی نے گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر کی اپنی سولہ سالہ مدت میں محض دو، اور ممبئی یونیورسٹی میں چودہ برس کے عرصہ میں صرف چار طلبہ کی پی ایچ ڈی کے لیے رہنمائی کی۔ اس زمانے میں طلبہ پی ایچ ڈی کی خاطر ان کے پاس جانے سے خوف کھاتے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کسی زندہ شخصیت پر پی ایچ ڈی کی اجازت نہیں دیتے ہیں، بہت مشکل اور خشک موضوعات دیتے ہیں اور خود کبھی کچھ لکھ کر نہیں دیتے۔ پھر ایسے پی ایچ ڈی گائیڈ کا کیا فائدہ؟

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں کلچرل تبادلے کی اسکیم کے تحت ڈاکٹر دلوی کا ایک ماہ کے لیے قاہرہ جانا ہوا۔ دو برس بعد غالباً 1993ء میں ایک سیمینار میں شرکت کی غرض سے انہیں دوبارہ قاہرہ کی دعوت ملی جہاں انہوں نے ''انیسویں صدی میں ہندوستانی اور مصری ادب کے باہمی اثرات'' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ گمان غالب ہے کہ ان کا یہ مقالہ وہاں کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا مگر قاہرہ کے حسن پر ڈاکٹر دلوی کے ظاہری و باطنی حسن کا ایسا اثر ہوا کہ اگلے ہی برس انہیں عین شمس یونیورسٹی، قاہرہ میں شعبہ اُردو کے قیام و انتظام کی خاطر بلایا گیا۔ مگر ان کے بہی خواہوں کو ان کا یوں بار بار قاہرہ جانا پسند نہیں آیا تو انہوں نے ملک میں پلیگ کا قہر پھیلا دیا اور ڈاکٹر دلوی کا سفر منسوخ ہوگیا۔ چند ماہ بعد پلیگ کے بادل چھٹے اور ہوائی اڑانیں دوبارہ شروع ہوئیں تو وہ تیسری مرتبہ قاہرہ گئے اور عین شمس یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے ڈیڑھ برس قیام کیا۔ واپسی کے بعد کبھی انہوں نے اپنے قاہرہ سفر کے بارے میں خود گفتگو نہیں کی۔ اس کے برعکس ہمارے ایک پروفیسر دوست جو چند ماہ کے لیے قاہرہ یونیورسٹی میں بحیثیت طالب علم گذارنے کے بعد تعلیم ادھوری چھوڑ کر ہندوستان لوٹ آئے تھے اور لوٹنے کے بعد ان کی ہر گفتگو، ہر تقریر کا پہلا جملہ یوں شروع ہوتا تھا۔ ''جب میں قاہرہ میں تھا..........'' یہ سلسلہ ان کے ریٹائرمنٹ تک جاری رہا۔

یوں تو علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی وضع انوکھی ہے اور وہ سارے زمانے سے نرالے ہیں، لیکن ان کی شخصیت کا ایک پہلو جو سب سے نرالا ہے وہ یہ کہ وہ اپنے مخالفین

اور اپنے دشمنوں کو چند دنوں میں اپنا دوست اپنا ہم نوا بنانے کا ہنر جانتے ہیں ۔مگر خود ان کے دشمنوں کو گلہ ہے کہ اس معاملے میں وہ بہت Selective اور کفایت شعار ہیں ۔ بہت پرانی بات نہیں ہے ایک بزرگ ادیب ڈاکٹر دلوی کے سخت ترین مخالف تھے اور ان کے جانی دشمن ہونے میں صرف ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی ۔ اچانک ایک روز خبر آئی کہ دلوی صاحب یونیورسٹی میں ان ہی بزرگ ادیب کا جشن منا رہے ہیں اور سیمینار منعقد کررہے ہیں۔ میں نے ایک روز موقع پاکر بزرگوار سے پوچھ ہی لیا کہ یہ کایا کلپ کیسے ہوگئی۔ خلاف توقع رنجیدہ ہوگئے اور کہنے لگے ''ایک دن صبح سویرے دلوی صاحب میرے مکان پر تشریف لے آئے اور کہنے لگے میں یونیورسٹی میں آپ کی طویل خدمات کا جشن منانا چاہتا ہوں ۔ مجھ سے انکار نہیں ہوا اور میں نے ہاں کردی۔''

تحقیق ،لسانیات اور تراجم پر مشتمل ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی دو درجن سے زائد کتابیں ہیں۔ دو مزید کتابیں ''مہاتما گاندھی ، زبان کا مسئلہ اور اُردو'' اور ''عطیہ بیگم فیضی کی ڈائری'' زیر طبع ہیں۔ اُردو کادمیوں کے سارے بڑے انعامات سے انہیں سرفراز کیا جاچکا ہے،جس میں یوپی اُردو اکادیمی کا ادبی خدمات کا سب سے بڑا انعام (پانچ لاکھ روپئے) بھی شامل ہے، جو انہیں پچھلے برس دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر دلوی کو شدت سے چاہنے والوں کا یہ کہنا ہے کہ انہوں نے آج تک کوئی تخلیقی کام نہیں کیا لیکن جن لوگوں نے ان کی وہ نظم جو انہوں نے مادر علمی اسماعیل یوسف کالج کو خراج عقیدت کے طور پر اور دوسری نظم جو انہوں نے یونیورسٹی کو الوداع کہتے وقت لکھی تھی ، کا مطالعہ کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ دلوی صاحب کے اندر ایک بہت اچھا شاعر بھی چھپا ہوا ہے جسے لسانیات اور تحقیق نے باہر نہیں آنے دیا۔اس کے علاوہ وہ سنسکرت شاعر بھرتری ہری کے مستند کلام کے ترجمے میں بھی تخلیق کار کا رول ادا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ان کا ترجمہ Translation سے آگے بڑھ کر Transcreation کا مرتبہ حاصل کرلیتا ہے، ایک مثال دیکھئے:

ایک حسینہ ہوکر مقابل میں/جس کی آنکھیں ہوں روشن و تاباں/حسن کا جن میں کچھ غرور بھی ہو

جس کا سینہ گداز وعریاں ہو/ دل نشیں جس کے سب نقوش بھی ہوں/جس کی زلفوں کی دلفریب گھٹا

اس کے نازک بدن پہ چھائی ہو/کون ایسے میں ہوگا خوش / اپنے ہوش وخرد سنبھال سکے؟

آج ہم مراٹھی کے مشہور ومقبول ڈرامہ نگار اداکار ، ادبی مضمون نگار ، سیاسی صحافی اور سماجی مبصر، وجے تندولکر کے شاہ کار مراٹھی ڈرامے ''شان تتا! کورٹ چالو آہے'' کا اُردو ترجمہ جسے ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے ''خاموش ! عدالت جاری ہے'' کے نام سے کیا ہے ، کی رسم اجرا میں شریک ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی اس سے قبل بھی دو مراٹھی ناولوں (ساوتری اور رن آنگن) کا ترجمہ کرچکے ہیں ، جو ان کی مراٹھی اُردو خدمات کا روشن ثبوت ہیں۔ یہ ڈرامہ وجے تندولکر نے 56 برس پہلے لکھا تھا اور جس کا ترجمہ ڈاکٹر دلوی نے 25 برس پہلے کیا تھا جو کسی وجہ سے پہلے شایع نہیں ہوسکا۔ اگر یہ وقت پر شایع ہوجاتا تو یہاں مختلف مہمان اور مختلف سامعین تشریف فرما ہوتے اور ممکن ہے خود شری وجئے تندولکر یہاں بہ نفس نفیس موجود ہوتے ۔

یہ ڈراما سوئس ناول نگار اور ڈراما نویس فریڈرک ڈیورین میٹ (Friedrick Durrenmatt) کے ناول A Dangerous Game (1956) (اصلی نام Die Panne یعنی Traps) پر مبنی ہے جو وجے تندولکر نے 1963ء میں لکھا تھا۔ یہ ڈراما اب تک سولہ زبانوں میں ترجمہ کیا جاچکا ہے۔اس کا پلاٹ یوں ہے کہ ٹیچروں کا ایک گروپ ایک گاؤں میں ڈراما پیش کرنے پہنچا ہے۔ایک اداکار کے غیر حاضر رہنے پر ایک مقامی نوجوان اداکار کو اس کی جگہ لیا جاتا ہے۔ اس نئے اداکار کو عدالت کی کارروائی سمجھانے کی خاطر ایک خیالی اور بناوٹی مقدمے کی برجستہ

ریہرسل شروع کی جاتی ہے، جس میں ڈرامے کی ایک اداکارہ مس بینارے کے خلاف نومولود بچے کے قتل کا فرضی الزام لگایا جاتا ہے۔ اچانک پتہ چلتا ہے کہ مس بینارے غیر حاضر اداکار، شادی شدہ پروفیسر ڈاملے سے ناکام محبت اور تعلقات کے نتیجے میں ان کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔

اس ڈرامے کے لکھے جانے کے بعد پچھلے پچاس برسوں میں پل کے نیچے سے کافی پانی بہہ چکا ہے اور عورتوں نے مکمل آزادی حاصل کرنے کی طرف کئی قدم بڑھا لیے ہیں۔ اب غیر شادی شدہ جوڑوں اور ماؤں کے علاوہ Live in Relationship کی مثالیں ہر سماج میں مل جاتی ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج بھی ہمارا سماج مردوں کا سماج ہے۔ مردوں کو ہر معاملے میں جتنی آزادیاں خود مردوں نے دے رکھی ہیں، عورتیں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتیں اور سماجی بندشوں کے خلاف عورت کا ایک قدم مردوں کو آج بھی برداشت نہیں ہوتا ہے۔ گو کہ کھل کر مخالفت کرنے کا شور ختم چکا ہے لیکن ایسی عورتوں کے خلاف ایک ان دیکھی خاموش عدالت آج بھی جاری ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے ڈاکٹر دلوی کا ترجمہ عیوب سے پاک ہے۔ گو کہیں کہیں مشکل الفاظ کا استعمال کھٹکتا ہے۔ ان میں ٹائپنگ کی ڈیڑھ درجن غلطیاں، ایسا لگتا ہے جان بوجھ کر چھوڑ دی گئی ہیں تاکہ لوگوں کو شک و شبہ نہ رہے کہ یہ اُردو کی کتاب ہے۔ میں ڈاکٹر دلوی کو اس کتاب کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ 18 ؍اگست کو ان کی 82 ویں سالگرہ سے پہلے ان کی اگلی دو کتابیں بھی منظر عام پر آجائیں گی۔

نوٹ: یہ مضمون ممبئی یونی ورسٹی میں پروفیسر عبدالستار دلوی کی ترجمہ کردہ کتاب ''خاموش! عدالت جاری ہے'' کی رسم اجرا کے اجلاس میں 29 ؍مارچ 2019ء کو پڑھا گیا۔

☆......○......☆

مظلوم بہاری
کھگول، پٹنہ

میاں جی

سمجھا ہے جسے آپ نے زرتار میاں جی
دراصل وہ ہے ریت کی دیوار میاں جی

بالو پہ چلاتے ہیں جو پتوار میاں جی
وہ خود کو سمجھتے بھی ہیں ہشیار میاں جی

اغلاط بھرے چھپتے ہیں منظوم تمہارے
اللہ سلامت رہے اخبار میاں جی

پابند شریعت کا یہ انداز
اللہ رے یہ آپ کا پندار میاں جی

بے باک سمجھتے ہیں جنہیں لوگ انہیں کے
سینے میں کدورت کے ہیں انبار میاں جی

چہرہ تو کبھی غور سے دیکھا نہیں اپنا
شیشہ کو بنا ڈالا گنہگار میاں جی

نا اہل سے لکھوا کے مضامین غزل پر
نادان خوشی سے ہوا سرشار میاں جی

خدمات ادب صفر، ہنر جن کا خوشامد
انعام کے ہوتے ہیں وہ حقدار میاں جی

دوچار نہیں سینکڑوں موجود یہاں ہیں
بازار خوشامد میں خریدار میاں جی

تعریف میں رکھتا ہے وہ تضحیک کا پہلو
مظلومؔ بھی کچھ کم نہیں فنکار میاں جی

......☆......

نورالحسنین
اورنگ آباد

وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

میں جب جب بشر بھائی کو دیکھتا تو مجھے جگر مرادآبادی یاد آتے تھے ، حالانکہ میری ملاقات اس زندگی میں کبھی بھی جگر صاحب سے نہیں ہوئی ۔ میں نے اُن کی تصویریں ہی دیکھی ہیں۔لیکن اس کے برخلاف میرے کچھ دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ جب بھی اُنھیں دیکھتے تھے تو اُنھیں کچھ اور ہی یاد آتا تھا۔ واضح رہے کہ اُن کی اس یاد کا تعلق اُن کی اُن تصویروں سے ہے جب اُن کے چہرے پر داڑھی نہیں ہوا کرتی تھی ۔لیکن داڑھی کے بعد ۔۔۔ جانے دیجیے ۔ ویسے بھی داڑھی کا احترام کرنا ہم لوگوں کا پیدائشی فرض ہے، اور اگر خدانخواستہ ہم اس فرض سے آزاد ہو گئے تو نہ جانے اس کے پیچھے سے اُبھرنے والے کیسے کیسے صنم اپنی وقعت کھودیں گے۔ میں نے ایک بار یہی سوال بشر بھائی سے کیا تھا کہ فاروق شمیم کے بعد عارف خورشید کی داڑھی ہی ادب کے لیے کیا کم تھی جو آپ نے بھی ۔۔۔؟

تو اُنھوں نے جواب دیا تھا،'' حسنین ۔۔۔! میں لوگوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کچھ داڑھیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو تنکوں سے پاک ہوتی ہیں ۔۔۔!''

بشر بھائی کا ظاہر و باطن بالکل ایک جیسا تھا ۔ وہ جو محسوس کرتے تھے اُسے پوری دیانت داری سے کہہ بھی دیتے تھے۔اور محض اپنی اس صاف گوئی کی وجہ سے اکثر اپنے مخالفین پیدا کر لیتے تھے ۔ ادب کا اُفق ہو یا سیاست کا میدان بشر بھائی نے سمجھوتوں کا رویّہ اختیار کیا ہی نہیں ۔ ساری صلاحیتوں کے باوجود بھی وہ اپنے نظریات کے گنبد سے کبھی باہر نکلے ہی نہیں ۔ اُنھوں نے اپوزیشن گروپ کی انگلی تھامی تو کبھی اُسے انگوٹھا دکھایا نہیں ، حالانکہ اُنھیں کئی بار برسرِ اقتدار پارٹی نے اپنی گود میں بٹھانا چاہا لیکن اُنھوں نے ضمیر فروشی کے پالنے میں آسودگی کی خودغرض لوری پر اپنی جاگتی آنکھوں کو کبھی نیند کے حوالے کیا ہی نہیں ، اور زندگی کی کٹھن راہوں پر ثابت قدمی سے ڈٹے رہے ۔ مشکلات کا سامنا کیا ، لیکن کسی کے آگے اپنے اُصولوں کا سودا نہیں کیا ۔ چپ چاپ تنہا اپنے پیروں کے کانٹے بھی خود ہی دور کرتے رہے اور اپنا راستہ بھی بناتے رہے ۔ سیاست اگر اُن کا مول طئے نہ کرسکی ، تو اس زبان نے بھی اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا جس میں لکھا ہوا اُن کا ایک ایک لفظ اُن کے فہم و ادراک کا دفتر کھولتا تھا ، اُن کی تنقیدی بصیرت کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ اُن کے تنقیدی مضامین کی کتاب '' نیا ادب نئے مسائل'' کی اہمیت سے کسی ناقد کو انکار بھی نہیں لیکن چراغ تلے اُس اندھیرے کی طرف دیکھنے کو کوئی تیار نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُسی چراغ سے سبھی نے روشنی حاصل کی ، جس کی علمیت پر کسی یونیورسٹی کی جانب سے گریجویشن یا پوسٹ گریجویشن کرنے کا الزام بھی نہیں لگا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کتنے ہی ڈگری یافتہ اساتذہ شب کی تاریکیوں میں اُنھیں ڈھونڈھتے پھرتے تھے اور اُن کے علم سے اپنی شمع روشن کرکے اپنی روزی کو حلال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اُن سے پوچھا تھا کہ آخر ایک تعلیم یافتہ گھرانے کے فرد ہونے کے باوجود بھی آپ ڈگریوں کے بوجھ سے کیسے محفوظ رہ گئے ۔؟ تو اُنھوں نے مجھے بتایا تھا،'' حسنین ۔۔۔! مجھے ڈگریوں سے سجانے کی خاطر خاندان کے ہر فرد نے کوششیں کی ، یہاں تک کہ مجھے حیدرآباد بھی روانہ کیا ، لیکن میری

تقدیر میں وہ اُستاد تھا ہی نہیں جو مجھے پڑھا سکے۔ زبان و بیان پر قدرت حاصل کرنے کی غرض سے میں میر تقی میر کی طرح کسی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر تو نہیں بیٹھا، البتہ میں نے کالج کے بجائے کافی ہاؤس کی ادبی محفلوں کو ترجیح دی۔ یوں والدین کا جائز روپیہ اور اپنے قیمتی تعلیمی سال ٹھکانے لگانے کے بعد جب میں اورنگ آباد واپس آیا تو میرے ایک قریبی دوست جو اچھے خاصے شاعر بھی تھے اور اُن دنوں ایک کالج میں پارٹ ٹائم لکچرر تھے، وہ بضد ہوگئے کہ میں اُن کے کالج میں داخلہ لے لوں، کم از کم گریجویٹ تو ہو ہی جاوں گا۔ تب میں نے اُنھیں بھی جواب دیا تھا کہ چھوٹے بھیا یہ تو سوچو، رات کو میں تم کو پڑھاؤں اور پھر صبح کلاس میں بیٹھ کر تم سے پڑھوں؟ ۔۔۔ توبہ کرو ۔۔۔ ایسی ڈگری سے تو جہالت کی نیک نامی بھلی۔

بشر نواز نام تھا ایک نہایت حاضر جواب انسان کا، وہ مقابل کی ہر بات کا ایسا برجستہ جواب دیتے تھے جیسے کرکٹ کھلاڑی سعید انور ہر بال پر چوکا لگاتا تھا۔ ہم میں سے کئی لوگ ایسے ہیں جو اُنھیں محض اس لیے تے تھے کہ سنجیدگی پھلجھڑیوں میں تبدیل ہوجائے۔ ایسے ہی ایک بار مسجد عماد میں کسی کا عقد تھا۔ بشر بھائی اپنے ہاتھوں میں چپلیں اُٹھائے ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کس حصے میں بیٹھا جائے کہ اچانک لطیف قریشی جو اپنے مسخرے پن کی وجہ سے کافی شہرت رکھتے تھے، اُنھیں دیکھ کر گویا ہوئے،" بشر بھائی آپ کے ہاتھوں میں چپلیں؟"

"ہاں بابا۔۔۔ تمھیں دیکھنے کے بعد اُنھیں ہاتھوں میں اُٹھانا ہی پڑتا ہے۔"

بشر بھائی کا یہ جواب سننے کے بعد اُس سنجیدہ محفل کا کیا حال ہوا ہوگا یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

بشر بھائی کے مزاج میں مزاح کی حس کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بات خواہ کچھ ہو، اُن کے پاس پہنچ کر قہقہے میں تبدیل ہوجاتی تھی۔ ایک مرتبہ ہم افسانہ نگار اُنھیں اُن ہی کے مکان میں گھیرے بیٹھے تھے کہ پوسٹ مین نے ایک لفافہ اُنھیں تھمایا، ذہن جدید کے مدیر زبیر رضوی نے اُنھیں لکھا تھا کہ یہ دہائی افسانے کی دہائی ہے اور آج شاعری سے عمدہ افسانہ لکھا جارہا ہے۔ بشر بھائی آپ اس سلسلے میں ایک مضمون لکھ دیں۔

خط پڑھتے ہی اُنھوں نے عارف خورشید کی طرف دیکھا، اور پھر کہا،" عارف تم اُسے اپنا کوئی تازہ افسانہ بھیج دو، اُس کی سمجھ میں آجائے گا کہ کہ واقعی آج کل اچھا کیا لکھا جارہا ہے۔"

بشر بھائی کو مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اُن کے ہاتھوں میں وہ کتابیں بھی نظر آجاتی تھیں جو کسی قاری سے پڑھی نہیں جاسکتی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں بھی ایک بار اُن سے سوال کیا تھا کہ آپ یہ صرف نمائش کے لیے کرتے ہیں یا اس کے پیچھے بھی کوئی مقصد کارفرما ہے؟ تو اُنھوں نے جواب دیا تھا،" حسنین تمہارے افسانوں کا مجموعہ بھی ہم نے نہیں پڑھا تھا لیکن ایک آدھ بار اُسے تمہارے ہاتھوں میں دیکھنے کے بعد کیا تمہاری طرف لوگ متوجہ نہیں ہوئے تھے؟"

میں نے کہا،" بلاشبہ ۔۔۔ وہ صرف متوجہ ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ اُنھوں نے اُسے پڑھا بھی تھا اور تعریفی مضامین بھی لکھے تھے اور ۔۔۔"

ابھی میں کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا کہ اُنھوں نے مجھے روک دیا ، اور پھر کہنے لگے،" حسنین تمہارا یہ اعتراف تو ٹھیک ہے کہ لوگ متوجہ ہوئے تھے، لیکن تمہاری کتاب پڑھنے کے بعد تعریفی مضامین بھی لکھے گئے، البتہ یہ جھوٹ ہے۔"

میں نے کہا،" مطلب ۔۔۔؟"

تو اُنھوں نے سمجھایا،" دیکھو آج کسی کی کتاب کو اور خصوصاً تمہاری نسل کی لکھی ہوئی کسی کتاب کو پڑھ کر خوبیاں تلاش کرنا بہت مشکل کام ہے۔ لوگ اس لیے بنا پڑھے، اس اُمید پر لکھ دیتے ہیں کہ ہمارے اس مضمون کو بھی کون پڑھنے والا ہے؟ سوائے اُس شخص کہ جس پر یہ لکھا گیا ہے۔"

مجھے اچانک جوگندر پال یاد آگئے۔ جنھوں نے میری طرح بہت سارے نوجوان ادیبوں کو اُن کی کتابیں ملنے پر لکھا تھا کہ

تمہاری کتاب ملی، میں نے ایک ہی بیٹھک میں پڑھ ڈالی، تم میں بڑے امکانات ہیں۔اپنی شرکتوں کو بنائے رکھو۔

اور ہم سب خواہ مخواہ ادب کے آسمان کے نیچے اندھیرے کی دبیز چادر تانے اپنے امکانات سے روشن ہونے والے مناظر کو تاکتے ہی رہ گئے۔

یہ المیہ ہماری نسل کا نہیں ہے۔غور کرو تو ہر اُس نسل کو یہ عذاب ڈھونا ہی پڑتا ہے، جب وہ ادب میں نووارد ہوتی ہے۔ چنانچہ غالبؔ کو اپنے وقت سے، پریم چند کو اپنے حالات سے، اور بیدی کو منٹو سے یہی شکایت تھی کہ اُن کی اہمیت کو نہیں سمجھا گیا، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اہمیت جتائی نہیں منوائی جاتی ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب بشر بھائی بھی ادب میں نووارد تھے اور آسمانِ ادب پر سکندر علی وجدؔ، مخدوم محی الدین، سردار جعفری، ،کیفی اعظمی اور قاضی سلیم کا طوطی بولتا تھا۔ایسے ہی ایک مشاعرے کے سلسلے میں اپنے وقت کے یہ آفتاب سرزمین اورنگ آباد میں طلوع ہوئے تھے اور بعد مشاعرہ مولوی یعقوب عثمانی کے مکان میں ایک گروپ فوٹو کا اہتمام کیا گیا تھا۔

بشر نواز اُس وقت صرف بشیر تھے۔ چنانچہ جیسے ہی وہ اُس گروپ میں جا کر کھڑے ہوئے تو قاضی سلیم نے اُنھیں یہ کہہ کر گروپ میں سے ہٹا دیا تھا کہ بشر ابھی تم بہت جونیئر ہو۔

اور پھر اس جونیئر کے لیبل سے نکلنے کے لیے بشر بھائی کو بہت سارے ہتھکنڈوں سے بھی گزرنا پڑا۔شاید آپ کو یقین نہ آئے، وہ کسی زمانے میں پہلوانی بھی کرتے تھے اور باضابطہ کسی اُستاد کے اکھاڑے سے وابستہ بھی تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا تھا، ''بشر بھائی پہلوانی کا شاعری سے کیا تعلق ہے؟''

تو میرے اس سوال پر پہلے وہ مسکرائے اور پھر اپنے مخصوص لہجے میں اُنھوں نے جواب دیا، '' حسنین۔۔۔! آج تک تم نے کبھی ہمیں کسی مشاعرے میں ہوٹ ہوتے ہوئے دیکھا۔۔۔؟ دراصل اُس زمانے میں کلام کے ساتھ ساتھ شاعر کے بدن میں بھی دم خم ہونا ضروری ہوتا تھا اور آج تم لوگ ۔۔۔صرف زبان کی بھی تاب نہیں لا سکتے۔۔۔!''

اور میں سوچنے لگا، بشر بھائی ویسے بھی پہلوانی کا لگا ہوا زخم تو بھر سکتا ہے، لیکن آپ کی زبان کی تاب واقعی کون لا سکتا ہے۔ ؟ پھر میں نے آہستہ سے کہا، '' کتنے ہی کلن خان افسانہ نگاری سے تائب ہو گئے اور کتنے ہی نوجوان شاعری کی ہری ہری گھانس کے باوجود بھاگ نکلے۔''

'' ہاں بابا۔۔۔لیکن پھر بھی ادب اُن سے پوری طرح پاک نہیں ہو سکا، اب وہ اپنے آپ کو مزاح نگار کہتے ہیں۔لوگ اُن کی جہالت پر ہنستے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے مضمون کو داد مل رہی ہے۔''

بشر بھائی کی اس دلیل پر میں نے بھی کچھ سوچنے کی جسارت کی، کچھ نام کو یاد کرنے کی کوشش کی اور پھر گھبرا کر خود ہی اپنی سوچ سے باہر آ گیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں ابھی تک افسانہ نگاری کے میدان سے باہر نہیں آیا۔

بشر بھائی کو اپنے وطن سے اپنی مٹی سے بے انتہا محبت تھی۔ اسی طرح چھوٹوں سے شفقت سے پیش آنا اور اپنے سے بڑوں کا احترام کرنا اُنھیں یہ خوبیاں وراثت میں ملی تھیں۔فلمی مصروفیت کے باعث وہ کچھ عرصہ اورنگ آباد سے غائب بھی رہے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز اپنا شامنامہ مالیگاؤں سے جاری کرنے جا رہا تھا۔اور ہم سب لوگ اس سلسلے میں مرحوم عزیز خسرو کی قیادت میں مالیگاؤں گئے تھے۔ میں نے وہاں پر دیکھا کہ بشر بھائی محترم قاضی سلیم کا کس درجہ خیال رکھتے ہیں۔ کس طرح اُن کے آرام کی فکر کرتے ہیں۔ اُن کا لہجہ اُن کے ساتھ کس قدر میٹھا ہے۔ واپسی میں اتفاق سے میں بھی اُن ہی کی کار میں تھا، قاضی صاحب کے اصرار پر بشر بھائی نے ایک کے بعد ایک کئی غزلیں سنائیں۔ اورنگ آباد جب ہم لوگ پہنچے تو قاضی صاحب کہنے لگے، تم یہاں نہیں تھے تو میں بڑا بے چین تھا، اب تم آ گئے تو میں خوش ہوں، کیونکہ میرا مقابل میں تم ہی کو سمجھتا ہوں۔

اور ہم دکن باسیوں کے لیے قاضی سلیم اور بشر نواز ادب کی وہ آنکھیں تھیں ، جن کے باعث ہم ادب کے معیار اور مزاج کو پرکھتے تھے ۔ اُن پر اتراتے تھے ۔فخر کرتے تھے، اور کسی بھی مقام پر پورے اعتماد کے ساتھ اُن کے نام پیش کرتے تھے ۔ اُن کی درازیِ عمر کی دعائیں ما تھے ۔ بشر بھائی کی حیات میں اُن کے جشن کی تیاریاں ہو رہی تھی ۔ اس جشن میں پڑھنے کے لیے اپنے مکان میں بیٹھا میں اُن پر مضمون لکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے رشتے کی ایک بھابھی نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا لکھ رہے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ بشر بھائی پر مضمون لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں ، اُن پر ایک بڑا جلسہ کرنے والے ہیں ہم لوگ ۔

اُنھوں نے غصے سے میرے سامنے کے کاغذات کھینچ ڈالے ، اور پھر غصے سے دھاڑیں ، ” شرم نہیں آتی تمھیں ایسی حرکت کرتے ہوئے ، خدانخواستہ کیا بشر بھائی مر گئے جو تم اُن پر مضمون لکھنے بیٹھ گئے اور جلسہ کر رہے ہو؟

میرا سر واقعی شرم سے جھک گیا ، میں نے کہا ، ” بھابھی یہ آپ کا قصور نہیں ہے ۔ ہم اردو والوں کا یہ المیہ ہے کہ ہم نے کبھی اپنے فنکاروں کو اُن کی زندگی میں اُن کی خدمات کا اعتراف کیا ہی نہیں ۔“

بشر بھائی کے جانے کے بعد اب ہمیں یہ احساس جاگا کہ ہم نے بشر نواز کی خدمات کا اعتراف تو اُن کی حیات میں نہیں کیا لیکن ہم نے اپنے سینئر افسانہ نگاران الیاس فرحت ، رفعت نواز اور محمود شکیل کی ادبی خدمات کا جشنِ اعتراف منایا ہے ۔

بشر بھائی کا اور میرا ساتھ بہت پرانا رہا ہے ۔ وہ میرے بچپن کے محافظ ، میری جوانی کے پاسباں ، میری لغزشوں کے مصلح ، میری تحریروں کے محرک تھے ۔ میں نے اعلی قدروں کی امانت اُن ہی سے حاصل کی ہے ۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے بہت کچھ نہیں بلکہ سب کچھ اُن ہی سے سیکھا ہے تو شاید غلط نہ ہوگا ۔ میں اُن کی نجی زندگی سے بھی اُتنا ہی واقف ہوں جس قدر اُن کے بچے ، بعض افراد اُن پر انگلیاں اُٹھاتے ہوئے اُن کے مقابل آجاتے ہیں لیکن جانے کیوں اُن کے قد بے حد بونے نظر آتے ہیں ۔ جو شخص محفلوں کا چہیتا ہو ، جو شخص گھر میں ایک چاہنے والا شوہر ، جو بچوں کے حق میں ایک شفیق باپ ، جو بہن بھائیوں کے درمیان ایک بے لوث بھائی ، جو ماں باپ کا فرمابردار رہا ، جس کے گھر سے کبھی کسی نے کسی تنازعہ کی بو باس محسوس نہ کی ہو ، جس کے چاہنے والے غریب بستیوں سے لے کر فائیو اسٹار محفلوں تک پھیلے ہوئے ہوں ، جس نے صرف خوشیاں بانٹیں ، قہقہے بکھیرے ، جو اوروں کے درد میں تو شریک ہوتا رہا لیکن کسی کو اپنے درد کا شریک نہیں بنایا ، جو مجلسی زندگی گزارتا رہا ہو ، لیکن اپنے گھر کی توقیر سے غافل بھی نہیں رہا ، جو ہر طبقے کا پسندیدہ رہا ہو ، اگر اُس کے ساتھ کچھ افسانے بھی وابستہ ہوں تو وہ کوئی معنیٰ نہیں رکھتے ۔ اُس کی شہرت اور مقبولیت میں اُن کے باعث کوئی کمی نہیں آسکتی ۔

آپ کو یاد ہوگا میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ میں جب بھی اُنھیں دیکھتا ہوں تو مجھے جگر مراد آبادی یاد آتے ہیں ۔ خود جگر صاحب کی سوانح عمری کا یہ اقتباس سن لیجیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ میں حق بجانب ہوں یا نہیں ۔۔۔ جگر صاحب لکھتے ہیں :

” خوشامد میرا شیوہ نہیں ۔ جہاں کہیں سچی محبت اور اخلاص شرافتِ نفس اور انسانیت محسوس کر لیتا ہوں ، میں اُن کا ہو جاتا ہوں ۔ عام طور پر لوگ اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھ کر تعلقات قائم کرتے رہتے ہیں ، بڑھاتے ہیں اور فوائد حاصل کرتے رہتے ہیں ۔ میں عام لوگوں سے کچھ مختلف المزاج واقع ہوا ہوں ۔ اس روش کو سخت ناپسند کرتا ہوں ۔ اپنے ذاتی فوائد کے لیے ا اللہ میں نے اپنے خاص الخاص احباب کے علاوہ کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی ۔ خود دارانہ زندگی بسر کی اور اپنی اس روش پر نازاں بھی ہوں ۔“

☆......○......☆

سیما شکور
حیدرآباد

شوہر

شوہر کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً

بے چارے شوہر :اس قسم کے شوہر اپنی شکل سے ہی بے چارے دکھائی دیتے ہیں! اگر وہ ہنستے بھی ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ رو رہے ہوں۔ بیویاں اُن پر حکومت کرتی ہیں کیوں کہ اُن کی تنخواہ شوہر سے زیادہ ہوتی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ ایسی بیویاں بھاری بھر کم جہیز کے ساتھ اپنے سسرال میں جلوہ افروز ہوتی ہیں۔ ایسے شوہر اپنی بیویوں کے غلام ہوتے ہیں۔ اُن کے چہروں پر بے چارگی کی ایسی چھاپ لگ جاتی ہے جو ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ وہ اپنے والدین کے بجائے بیوی کی بات، گردن اور آنکھیں جھکائے سنتے ہیں اور جی جی کہتے رہتے ہیں۔ ہائے یہ بے چارے مظلوم شوہر۔ جو ایسے بکے جیسے کوئی کتا ہے۔ ایسا کتا جو اپنے مالک کے پھینکے ہوئے ایک روٹی کے ٹکڑے پر دم ہلاتا ہے۔ ایسے شوہروں کی بے چارگی اور وفاداری تو کتے پر بھی سبقت لے جاتی ہے!

پرائے شوہر :جی ہاں یہ پرائے شوہر اس لیے کہلائے جاتے ہیں کہ جنہیں یہ تو یاد نہیں رہتا کہ اُن کی شادی کس تاریخ کو ہوئی تھی؟ لیکن کسی خاتون کے گالوں پر ہنستے وقت ایک ڈمپل پڑتا ہے کہ دو، یہ انہیں بہ خوبی علم ہوتا ہے۔ ایسے شوہر فلمی اداکاراؤں پر دل و جان سے فدا ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی سیدھی سادی بیوی ذرا اچھی نہیں لگتی۔ وہ میک اَپ زدہ خواتین میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی بیوی کو نیچا دکھاتے ہیں اور بناوٹی خواتین کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایسے دیکھتے ہیں جیسے وہ تاج محل دیکھ رہے ہوں۔

نکھٹو شوہر :یہ شوہروں کی وہ قسم ہوتی ہے جنہیں اپنی بیوی اور سسرال والوں کی کمائی کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ وہ باورچی خانے میں مصروف رہتے ہیں، یا بچوں کو سنبھالتے نظر آتے ہیں۔ انہیں باہر کے کام کے بجائے گھریلو شوہر بننا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی کمائی پر ہی تکیہ کیے رہتے ہیں اور مزے سے سکون کی نیند سوتے ہیں۔ اُن کی بیوی کتنی ہی تکلیفیں اٹھائے انہیں بالکل بھی پرواہ نہیں ہوتی۔

دوغلے شوہر :یہ شوہروں کی وہ قسم ہوتی ہے جو باہر تو ہی ہی ہاہا کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن گھر میں وہ ہٹلر بنے رہتے ہیں۔ ساری دنیا اُن کے اخلاق کے گن گاتی ہے۔ وہ دوسروں کے مسائل سلجھانے میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں مگر گھر میں اُن کی بیوی بچوں کے کیا مسائل ہیں اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ہر کوئی اُن سے مدد کا طالب ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنا قیمتی وقت ہر ایک کے لیے وقف کرنے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ وہ ہر دعوت میں شرکت کرتے ہیں مگر اکیلے۔ بیوی کو سات پردوں میں رکھ کر وہ سمجھتے ہیں انہوں نے میدان فتح کرلیا ہے۔ اُن کے ہاں بیوی اور اسٹور میں پڑے بے کار سامان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بیوی کی ہر سیدھی بات کا جواب ٹیڑھے انداز سے دینا اُن کی عادت ہوتی ہے۔

شکی مزاج شوہر :جی ہاں یہ شوہروں کی ایسی قسم ہے جو نہایت ہی خطرناک ہے۔ ایسے شوہروں کی بیویاں مظلومیت کی جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہیں۔ وہ اپنی بیویوں پر ہمیشہ شک کرتے ہیں۔ وہ نہ ہی کسی سے مل سکتی ہیں اور نہ ہی کسی کو

اپنے ہاں بلاسکتی ہیں۔ اپنی بیوی کی ہرحرکت پر ایسے شوہروں کی نظر بڑی گہری ہوتی ہے۔ وہ اپنی بیوی سے ایسے سوال کرتے ہیں جیسے کوئی انسپکٹر اپنے مجرم سے پوچھ تاچھ کررہا ہو۔

ھنڈیالو شوھر : جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے، یہ ہنڈیالو لفظ دراصل ہانڈی سے نکلا ہے۔ یہ شوہروں کی وہ قسم ہے جو مردوں سے زیادہ عورتوں کی صحبت میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور اِدھر کی بات اُدھر کرنا اُن کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ موقع پاتے ہی دو دوستوں کو لڑا دینا اُن کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ اس میں انہیں بہت مزہ آتا ہے۔ وہ دیکھنے میں ملنسار لیکن انتہائی شاطر اور خودغرض ہوتے ہیں۔ وہ جس کو دیکھتے ہیں اسی کی چمچہ گری کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں آپ تھالی کا بیگن بھی کہہ سکتے ہیں۔

مجازی خدا شوھر : ایسے شوہروں کی بیویاں بے حدخوش ہوتی ہیں۔ یہ شوہروں کی سب سے اعلیٰ اور نایاب قسم ہے۔ ایسے گوہر نایاب کو پاکر کونسی بیوی ہوگی جو خوش نہ ہوگی۔ ایسے شوہر ملنسار، مہذب اور ہر کسی کے حقوق سے بہ خوبی آگاہ ہوتے ہیں اور بیوی کو بیوی ہی نہیں ایک دوست سمجھتے ہیں۔ اپنی بیوی سے ہر موضوع پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی شریک حیات پر مسکراہٹوں کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ وہ ہر دکھ میں اپنی بیوی کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ اپنے مسائل کو آپس میں بیٹھ کر ہی حل کرتے ہیں۔ والدین اور بیوی دونوں کو مساوی حق دیتے ہیں۔ جو ایک بہترین باپ ہوتے ہیں، باوفا ہوتے ہیں۔ ایسے شوہر اُن تازگی بھرے خوشنما پھولوں کی طرح ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر ماحول میں تراوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کا بندھن اتنا مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے کہ جنہیں کوئی بھی سازش کی آندھی گزند نہیں پہنچاسکتی!۔۔

☆......◯......☆

ایم توحید الحق
ناگپور

دیکھتا ہوں میں

پڑوسن سے جو کرتے ہیں شرارت دیکھتا ہوں میں
کہ مولانا کی گھر بیٹھے شرافت دیکھتا ہوں میں

کسی باوا کے قدموں کی یہ برکت دیکھتا ہوں میں
جو اپنے گھر میں اب بچوں کی کثرت دیکھتا ہوں میں

بری ہے کس قدر میری بھی دیکھتا ہوں میں
ترے ابا کی رستے میں جو صورت دیکھتا ہوں میں

جنہیں پڑھنا نہیں آتا بڑے عہدوں پہ قابض ہیں
یہی اب ہر طرف اردو کی حالت دیکھتا ہوں میں

بہت ملتی ہے صورت حور کی بیگم کی صورت سے
کہ جنت میں وہی ساری مصیبت دیکھتا ہوں میں

بگڑتے جارہے ہیں اس قدر بچے کہ اب اُن پر
اثر کرتی نہیں کوئی نصیحت دیکھتا ہوں میں

پکڑ لیتا ہے ایسے ہی کسی شاعر کو تھانیدار
غزل سننے کی ہے اس کو بھی عادت دیکھتا ہوں میں

انہوں نے وقف کر رکھا ہے خود کو قوم کی خاطر
کوئی جلسہ ہو ان کی ہی صدارت دیکھتا ہوں میں

جو پڑھ لیتا ہے بن جاتا ہے وہ بھی شاعرِ اعظم
مرے دیوان کی ایسی کرامت دیکھتا ہوں میں

......☆......

سید حشمت سہیل
شکاگو

ایک فقیر کا تجربہ

اک تھا فقیر جاتا تھا جو روز ما
مسجد کے اور مندر و گرجا کے سامنے

ملتی تو تھی رقم بسر اوقات کے لیے
کافی نہیں تھی جو گذر اوقات کے لیے

اک دن پہنچ گیا وہ کسینو کے سامنے
اللہ کے نام پر لگا خیرات ما

جو آ رہے تھے جیب کو خالی کیے ہوے
تھے وہ تو خود ہی صورتِ سائل بنے ہوے

لیکن جو آئے جیت کے پیسے لیے ہوے
چہرہ فروغ مئے سے گلستاں کیے ہوے

ڈوبے ہوئے تھے جسم و دل و جاں شراب میں
نے ہاتھ باگ پر تھے نہ پا تھے رکاب میں

دیکھا فقیر کو تو بڑھا جیت کا خمار
دیتا تھا کوئی ایک کوئی دو تو کوئی چار

اک اور آیا جس کا کہ نکلا تھا جیک پاٹ
تھا عرش پر دماغ نرالا تھا ٹھاٹھ باٹ

مٹھی میں نوٹ بھر کے وہ خیرات کر گیا
سائل کی بھوکی جھولی کو منہ تک وہ بھر گیا

پیسے ملے فقیر کو اک دم جو اس قدر
بولا وہ آسمان کی جانب اٹھا کے سر

تو بھی ہے خوب اے مرے رزاق دو جہاں
دیتا پتے کہاں کے ہے رہتا ہے تو کہاں

میاں ، بیوی اور غالبؔ

میاں بیوی میں تھی کچھ بحث و تکرار
تھے زیر بحث غالبؔ کے کچھ اشعار

کوئی جب فیصلہ ہو ہی نہ پایا
تو پھر تنگ آ کے بیوی نے سنایا

میں مرکر جب پہنچ جاوں گی جنت
تو خود غالبؔ سے کرلوں گی وضاحت

کہا شوہر نے کیا سمجھی ہو بی بی
وہ شاعر تھے شرابی اور کبابی

جہنم ہی میں ہوگا ان کو رہنا
کہا بیوی نے ' پھر تم پوچھ لینا '

پاگل پن میں

بیوی تھیں بیمار بہت تو شوہر لگ گئے پیار جتانے
لگے سنانے اپنی وفا کے اور محبت کے افسانے
بیگم جب تم ہی نہ رہوگی میں تو پاگل ہوجاؤں گا
کپڑے و پڑے پھاڑ کے اپنے جنگل کو میں نکل جاؤں گا
بیوی بولیں جھوٹ نہ بولو خوب سے تم کو جانتی ہوں میں
کتنی چاہت والے تم ہو اچھی طرح پہچانتی ہوں میں
میری آنکھیں بند ہوتے ہی دوسری عورت کر لاؤ گے
پاگل واگل کچھ نہیں ہو گے سہرا باندھ کے اٹھلاوگے
شوہر بولے کیا بتلاؤں کچھ بھی ممکن ہوسکتا ہے
پاگل پن میں پاگل انساں کوئی بھی حرکت کرسکتا ہے'

☆

ایک بے چارے شوہر کی داستان

آ گئے امریکہ جب ہم چھوڑ کر اپنا وطن
نو گرفتار قفس تھے ہم عزیزان چمن

ہم وہی اپنی بے ڈھنگی چال ہی میں مست تھے
جیسی عادت تھی کہ اپنی کھال ہی میں مست تھے

پر یہاں بیگم نے جوائن کرلی انگریزی کلاس
اور مکمل کی امور خانہ داری کی کلاس

کیا بتائیں ہم پہ یہ کیسی مصیبت آ گئی
اس نئی تعلیم کی صورت میں شامت آ گئی

سب سے پہلے لسٹ پر ان کی ہمیں تھے بے شعور
نزلہ تو کمزور پر گرتا سدا سے ہے حضور

اور کوئی کام تو باقی نہیں ہے ان کے پاس
روز اب گھر میں وہ لیتی ہیں فقط میری کلاس

ہم سے بیگم نے کہا انسان بننا سیکھ لو
اس نئی دنیا میں کیسے ہوگا رہنا سیکھ لو

ہم سمجھتے تھے کہ یہ پردیس اپنا دیس ہے
جانتی تھیں وہ بہت بگڑا ہوا یہ کیس ہے

بعد کھانے کے اگر لی میں نے اک اونچی ڈکار
میری ایسی حرکتوں سے ان کو چڑھتا ہے بخار

چھینک اگر آجائے تو ا للہ مت کہو
اس کے بدلے معذرت ’ ایکس کیوزمی ‘ کہہ کر کرو

چائے کی اب زور سے چسکی لگانا ہے منع
’ اس قفس کے قیدیوں کو غل مچانا ہے منع ‘

ہم بھلا کیا بول پاتے ان کی ان باتوں کے بعد
’ ہم کہ ٹھیرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد ‘

یہ خدا کا حکم ہے مردوں پہ سونا ہے حرام
اور یہاں بیگم کے ہاتھوں اپنا سونا ہے حرام

دیس میں جب تھے تو دن کے دس بجے اٹھتے تھے ہم
اور پھر بارہ بجے تک اینڈتے رہتے تھے ہم

اب یہ عالم ہے کہ تڑکے جاگنا مرغوں کے ساتھ
جانا پھر واکنگ کو اور آ کے لینا روز باتھ

اور اس پر حکم باہر کوئی قطرہ گر نہ پائے
اب بھلا کیسے کوئی منہ دھوئے اور کیسے نہائے

کھولنے میں نل کو یا شاور کو ڈر جاتے ہیں ہم
جیسے تھے ویسے ہی بس باہر نکل آتے ہیں ہم

ان کے جو احکام تھے اپنی سمجھ میں کچھ نہ آئے
آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے ئے

ہاتھ گر لگ جائے کھانے میں تو کار جاہلاں
کٹلری ہی کا ہے استعمال کار عاقلاں

میز پر کھانے کی بیٹھے ہم چھری کانٹے کے ساتھ
کیں بہت سی کوششیں پر کچھ نہ آیا اپنے ہاتھ

کیا پکڑ پاتے انہیں جو شوربے میں تھے مٹر
اہل ایماں کی طرح ڈوبے ادھر نکلے ادھر

تھا دگر گوں حال مجھ نا چیز پر تقصیر کا
’ مدعا عنقا تھا ان کے عالم تقریر کا ‘

☆

خیر گذری پھٹ نہ پایا ان کا وہ آتش فشاں
پھر بھی ہر انداز میں خاموش تھیں سو بجلیاں

ڈانٹ کھانے کے علاوہ اور کوئی خطرہ نہ تھا
' دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا '

چمچے کانٹے منہ میں بس آیا کیے جایا کیے
سارے جلوے دور سے نظروں کو ترسایا کیے

کیا لاشیں تھیں خوش مزہ کھانے سبھی آیا کیے
' کارواں گذرا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے '

کیا بتائیں دوستو شوہر کا اب جو حال ہے
یہ نئی تعلیم ہے یا شامت اعمال ہے

کہہ دیا بیگم سے ہم نے گریہی ہے سلسلہ
بخش دیجے ہم کو یہ مرغا لنڈورا ہی بھلا

بولیں بیگم ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

☆

ماڈرن کوہ ندا سے بلاوا

کوہ ندا سے بلاوا آیا
گرین کارڈ کا مژدہ سنایا
بوریا بستر ہم نے اٹھایا
یہاں پہ آ کے ڈیرا جمایا
ہم نے بھی امریکہ دیکھا
نئی دنیا کا تماشہ دیکھا
دوسروں نے بھی دکھایا دیکھا
سنئے صاحب کیا کیا دیکھا

امن یہاں ہے سکون یہاں ہے
پابندی قانون یہاں ہے

قدر علوم و فنون یہاں ہے
ایجادوں کا جنون یہاں ہے

دنیا بھر پر راج کرے ہیں
ں کو بے تاج کرے ہیں

تیزی سے ہر کاج کرے ہیں
کل کرنا تھا آج کرے ہیں

جس کو چاہیں سر پہ چڑھا دیں
گیدڑ کو یہ شیر بنادیں

جس سے بگڑیں خاک چٹادیں
تگنی کا یہ ناچ نچا دیں

ٹہل رہے ہیں چاند کے اوپر
خلا میں چکر پر ہیں چکر

پاور میں ہر ملک سے بڑھ کر
ان کا ٹھینگا سب کے سر پر

کام بہت بے سبب یہاں ہیں
سب سامان طرب یہاں ہیں

عیش کے رستے عجب یہاں ہیں
ننگوں کے بھی کلب یہاں ہیں

آگ لگائے مونچھوں والا
پکڑا جائے داڑھی والا

☆

سیمی کو سیمائی بولو
اینٹی کو اینٹائی سمجھو

شیڈول کو اسکیجوئل جانو
فل اسٹاپ کو پیریڈ مانو

میک اپ کیا حیران کرے ہے
کھنڈر کو چمنستان کرے ہے

بڈھی کو یہ جوان کرے ہے
بڈھوں کو ہلکان کرے ہے

راہ میں دیکھے ایسے منظر
کیا بتلائیں تم کو برادر

لایا ہمیں تقدیر کا چکر
غلط عمر میں صحیح جگہ پر

جب کوئی تیوہار جو آئے
چیزوں کی قیمت گر جائے

خریدی چیز پسند نہ آئے
بے جھگڑے واپس ہوجائے

جاب کرے ہیں جن کی بیگم
پارٹی فیشن بڑھتے ہر دم

گھر کے لیے اب ٹائم ہے کم
ٹک ٹک دیدم ، دم نہ کشیدم

برخوردار ہیں سب سے بڑھ کر
گلے میں زیور کان میں زیور

ٹیٹو سارے جسم کے اوپر
پہن کے گھومیں شرعی نیکر

☆

گر اپنی اولاد کو ڈانٹو
تو تھانے کے چکر کاٹو
پھر اولاد سے معافی مانگو
اپنے گھر میں بغلیں جھانکو
بازار اک دیوان یہاں ہے
دیس کی کچھ پہچان یہاں ہے
جلوہ ہندوستان یہاں ہے
شان پاکستان یہاں ہے
ہندو مسلم سکھ عیسائی
یہاں کی رونق سب نے بڑھائی
دیس میں چاہے کریں لڑائی
یہاں پہ سب ہیں بھائی بھائی
اپنے دیس سے شاعر آئے
ذاکر اور مقرر آئے
نوکر آئے تاجر آئے
فنکار اور مصور آئے
ساتھ میں لائے رنگیں راتیں
شعر اور نغمے کی برساتیں
حلیم نہاری کی سوغاتیں
کھٹے سالن میٹھی باتیں
ساتھ میں ان کے اردو آئی
علم و ادب کی خوشبو آئی
بن کر حسن کا جادو آئی
ناز سنبل و گیسو آئی
یہاں سہیل اب جی بھی لگاؤ
مسلم امریکن کہلاؤ
اسی میں اپنی راہ بناؤ
ورنہ بدھو گھر کو جاؤ

☆......○......☆

کے این واصف

میں بے چارہ

سنا ہے صحافی غریب یا متوسط گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں اور اگر امیر گھر میں پیدا ہونے والا صحافت سے جڑے اور دیانت دارانہ صحافت کرے تو اسے بھی غریب ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی ۔ میں بھی حیدرآباد دکن کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔اب تک ۶۷ خزائیں اور بہاریں دیکھ چکا ہوں، بوڑھا ہو گیا مگر بزرگی نہیں آئی کیوں کہ اب تک میرے بال پوری طرح سفید نہیں ہوئے ۔ادبی ذوق ورثہ میں ملا۔ لکھنے لکھانے کی لت نو عمری سے رہی ۔ ابتدا سے رجحان مزاح کی طرف رہا۔ پہلا خاکہ ۱۹۷۴ میں معروف مزاح نگار نریندر لوتھر (آئی اے ایس) پر لکھا جو انہیں بھی بہت پسند آیا جس کا ثبوت ان کا لکھا دو صفحہ کا ستائشی خط ہے۔

بی کام کیا مگر محاسب کی نوکری نہیں ملی تو فوٹو جرنلزم میں ڈپلوما کیا اور میدان صحافت میں کود پڑا۔ روزنامہ 'سیاست' سے سفر کا آغاز کیا اور انگریزی اخبارات ' دکن کرانیکل ' اور ' انڈین ایکسپریس' میں کافی عرصہ تک کام کیا۔۱۹۹۲ء میں سعودی عرب منتقل ہوا اور آرکیٹکچرل میگزین 'البناء' سے منسلک ہوا۔ وہاں سے اٹھارہ سال بعد ریٹائر ہوا اور آج کل 'سکسیس انٹرنیشنل اسکول' ریاض میں ایڈمنسٹریٹر بنا بیٹھا ہوں ۔

مزاح نگاری میں میری محبوب صنف خاکہ نگاری ہے ۔مگر نیوز فوٹو گرافر ، رپورٹر اور کالم نگار کی حیثیت سے زیادہ جانا جاتا ہوں (یہ لوگوں کا خیال بھی ہے) کیوں کہ ۱۹۹۴ سے اردو نیوز ، سعودی عرب کے لیے خبریں، مضامین اور 'سیاست' حیدرآباد کے لیے مسلسل ہفتہ وار کالم لکھ رہا ہوں ۔فوٹو گرافی میرا Passion ہے ۔انڈین ایمبسی ریاض کے تعاون سے یہاں فوٹو گرافی کے بہت سے شوز کیے ۔ ہندوستان کے تاریخی مقامات پر میری تیار کردہ کافی ڈاکیومنٹریز یوٹیوب پر موجود ہیں ۔

لکھاری ہوں مگر کوئی تخلص اختیار نہیں کیا ۔ ماں باپ کے دیے ہوئے نام کو اونچا یا بڑا کرنے کے بجائے مختصر کیا اور ' کے این واصف' کے نام سے بدنام ہوں ۔ ایک بیوی اور دو بچے ہیں ۔جس میں اضافے کا کوئی امکان نہیں ۔۔

knwasif@yahoo.com

whatsapp: 00966509834206

☆......☾......☆

عذرا نقوی

نوئیڈا

ایک ہی وقت میں رہتے ہیں کئی شہروں میں

کے این واصف صاحب کے بارے میں لکھنے بیٹھی تو اپنے ایک شعر کا مصرع یاد آ گیا۔

ایک ہی وقت میں رہتے ہیں کئی شہروں میں

واقعی لگتا ہے واصف صاحب ہر جگہ موجود ہیں۔ حیدر آباد کے مشہور اخبار ''سیاست'' میں کالم لکھ رہے ہیں، جدہ کے اردو نیوز میں رپورٹس اور مضامین لکھ رہے ہیں اور انگریزی کے اخبار سعودی گزٹ میں ان کی فوٹو گرافی کی دھوم ہے۔ کبھی ہندوستان کے مختلف تاریخی مقامات پر فوٹو گرافی کر رہے ہیں، اور کبھی ہندوستان کے تاریخی مقامات کے تصاویر کی زبردست نمائش منعقد کر رہے ہیں۔

قلم اور کیمرے کا لینس دونوں ان کی دسترس میں ہیں۔ فوٹو جرنلزم جس پیشہ ورانہ ایمان داری اور ذہانت کا متقاضی ہوتا ہے کہ وہ ان کی شخصیت میں سرایت کر گئی ہے۔ معاملہ فہمی، حس مزاح اور شائستگی اس میں اور شامل کر لیں تو سمجھیے کے این واصف صاحب کو اچھی طرح پہچان لیا۔ اپنے قلم اور کیمرے کے لینس سے انھوں نے معلومات بھی بہم پہنچائی ہیں اور دنیا کی سیر بھی کرائی ہے، نام بھی کمایا اور لوگوں کی محبتیں بھی سمیٹی ہیں۔ نہایت مہذب، اور سلجھے ہوئے مزاج کی وجہ سے ریاض کی کمیونٹی میں بہت مقبول تھے۔ اگر کسی سے کچھ شکایت بھی ہوئی تو دبی زبان سے کبھی ذکر کر دیا۔ وہ بھی کسی نجی ملاقات میں، محفل میں ہمیشہ کم گوئی ان کی خصوصیت رہی۔ اکثر لوگ پیار سے کے۔ این۔ واصف کو اور بھی مخفف کر کے انھیں صرف کے، این بھی کہتے تھے مگر مجھے یہ انداز تخاطب پسند نہیں آتا تھا، کیونکہ اس نام سے پرانے مشہور اداکار کے، این، سنگھ کا چہرہ یاد آ جاتا تھا جو واصف صاحب کے متبسم چہرے سے بالکل مختلف ہے۔

واصف صاحب سے تعارف سب سے پہلے ہندوستانی بزم اردو کے ذریعے ہوا تھا جو ریاض میں اردو کی تعلیم اور ادب کی ترویج کے لیے مختلف قسم کے پروگرام انڈین اسکول کے طلبا کے لیے منعقد کرتی تھی اور کمیونٹی کے لیے دیگر ادبی پروگراموں کا اہتمام بھی کرتی تھی۔ کمیونٹی کی دیگر ثقافتی انجمنوں کی طرح بزم اردو بھی ہندوستانی سفارت خانے کی سرپرستی میں سرگرم عمل رہی۔ ریاض میں مقیم حیدر آباد کے محبان اردو نے اس کی شروعات کی تھی، خاکسار ہی صرف غیر حیدر آبادی ممبر بنائی گئی تھی۔ آج بھی اس کے سب ممبروں سے میرے برادرانہ تعلقات ہیں۔ اس تنظیم میں واصف صاحب نہ صرف اپنی فوٹو گرافی کے ذریعے معاون رہتے تھے بلکہ اور کاموں میں بھی بغیر کسی خودنمائی کے جذبے کے پیش پیش رہتے تھے۔ اور جب ایمبیسی میں ایک خوب صورت سا آڈیٹوریم بن گیا تو خوب رونق بڑھ گئی۔ مشاعرے ہوئے، ماہنامہ شگوفہ کے لیے پروگرام ہوئے، ہر جگہ کے این واصف صاحب پیش پیش رہتے تھے۔ نہ صرف اردو کے پروگراموں کی بلکہ دیگر سارے پروگراموں میں فوٹو گرافی ان کے ہی ذمہ تھی۔ لہٰذا ان کا پاپولیرٹی گراف بڑھتا گیا۔ یہ گراف اور بڑھا جب سعودی عرب میں اردو کے اخبار کا اجرا ہوا۔

سعودی عرب میں اردو داں لوگوں کی ایک بڑی تعداد تھی جن میں اکثریت پاکستانیوں کی تھی۔ حیدر آباد دکن کے محبّ اردو بھی اچھی خاصی تعداد میں تھے اور کچھ یوپی کے لوگ جو اردو جانتے

تھے۔ ''اردو نیوز'' شروع ہوا تو کمیونٹی میں جیسے جان پڑ گئی۔ ابھی انٹرنٹ کا زمانہ شروع نہیں ہوا تھا۔ اردو نیوز میں زیادہ تر خبریں پاکستان سے متعلق ہوتی تھیں۔ اردو کی خبروں کی رپورٹنگ کے لیے، کے این واصف کے علاوہ اور کون ذمہ دار بنایا جاسکتا تھا کہ وہ 1980 سے سیاست اخبار سے فوٹو جرنلسٹ کے طور پر منسلک تھے۔ انڈین ایکسپریس میں دس سال اسٹاف فوٹو گرافر رہے، انگلش روزنامے ''دکن کرونیکل'' سے بھی تعلق رہا تھا، ا یٹڈ ویکلی آف انڈیا'' اور اور ''انڈیا ٹوڈے'' میں بھی فوٹو جرنسلٹ کے طور پر شامل رہتے تھے۔ اور اس زمانے میں ریاض سے شائع ہونے والے البناۃ میگزین میں ملازمت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور واصف صاحب ہندوستان کے دوسرے اہم رسائل سے متعلق رہے۔

خاکسار نے اس اخبار میں ہندوستانی خواتین کی نمائندگی کی ذمہ داری ازخود لے لی۔ بہت دلچسپ یادیں ہیں اس زمانے کی، حیدرآباد کے ایک صاحب اردو میگزین میں کالم لکھتے تھے، حیدرآباد کے صفدر صاحب بھی مزاحیہ مضامین لکھتے تھے۔ غرض کہ خوب ادبی گہما گہمی رہتی تھی۔ واصف صاحب نے سعودی عرب میں نہ صرف اخباروں میں ہندوستان کی نمائندگی کی بلکہ اپنی برسوں کی فوٹو جرنلزم کی مہارت سے تیار کی گئی ایک تصویری نمائش بھی ہندوستانی سفارت خانے کے زیر سرپرستی منظر عام پر لائے جس میں Early modern era کی اہم عمارات کی تصویریں مع مختصر تعارف کے شامل تھیں۔ نمائش میں خود تو نہیں دیکھ سکی لیکن بھلا ہو انٹرنٹ کا کہ اس نے ہندوستان میں بھی ہم تک اسے پہنچا دیا۔ اس نمائش میں ایک اور ہندستانی خاتون صبیحہ مجید کی سعودی عرب کی مشہور مقامات کی پینٹنگس بھی شامل تھیں۔ یہاں یہ بات میں ضرور کہنا چاہوں گی کہ سعودی عرب میں ہمارا سفارت خانہ ہندوستانی تارکین وطن کی فنکارانہ صلاحیتوں کا نہ صرف اعتراف کرتا ہے بلکہ بہت حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔

اخبار ''سیاست'' میں واصف صاحب کے کالم کے موضوعات کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ واصف صاحب کتنے، خلوص اور باریک بینی سے حالات، واقعات اور شخصیات کو دیکھتے ہیں اور کس روانی سے لکھتے ہیں۔ ان کا کوئی کالم محض خانہ پُری کی خاطر نہیں لکھا جاتا۔ اسی لیے لوگ اسے بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں۔

واصف صاحب نے اپنی کتاب کا نام خوب چنا ہے ''ذکر یاراں''۔ ان کا حلقہ یاراں یقیناً بہت وسیع اور دلچسپ ہوگا۔ منتظر ہوں کہ یہ کتاب میرے ہاتھ میں آئے، یقیناً بہت سے جانے پہچانے لوگ ہوں گے۔ میرے شوہر مرحوم ڈاکٹر پرویز احمد سے اور مجھ سے ان کا بہت خلوص کا رشتہ تھا۔ اردو نیوز اور کمیونٹی پروگرامز کے سلسلے میں ملاقاتیں ہوتی تھیں، لیکن ایک بھائی کی طرح انھوں نے میرا ایک کام بھی اپنے ذمے لے لیا تھا۔ خواتین سعودی عرب میں یوں اکیلی کہیں آتی جاتی نہیں تھیں۔ اردو نیوز سے جو ہمارے اعزازیہ کے طور پر چیک آتے تھے انھیں عرب نیوز کے دفتر سے منگوانا میرے لیے ایک کارِدارد ہوتا تھا۔ واصف صاحب جب اپنا چیک لینے جاتے تو میرا بھی لے لیتے تھے اور خود میرے گھر دینے آتے تھے۔ پرویز بھی ان سے بہت مانوس تھے خوب باتیں ہوتی تھیں۔ کبھی جب واصف صاحب کو فرصت ہوتی تو اپنے پیشہ ورانہ تجربات سناتے اور خاص حیدرآبادی لہجے میں خوب باتیں کرتے۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ ان کی تحریروں میں علاقائیت کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن بولتے ہیں تو ٹھیٹ حیدرآبادی لہجے میں جو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

میں سعودی عرب سے ہندوستان چلی آئی اور جب میں نے اردو نیوز میں اپنے لکھے مضامین کا انتخاب ''جہاں بنالیں اپنا نشیمن'' کے نام سے شائع کرانے کا ارادہ کیا تو واصف صاحب نے بہت خلوص کے ساتھ ایک تعارفی مضمون ارسال کیا بعنوان ''ریاض کی بجیا، عذرا نقوی'' پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اب ان سے کئی برس سے نہیں ملی لیکن بھلا ہو واٹس ایپ اور فیس بک کا، آدھی ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے۔ اللہ ان کو سلامت رکھے۔

☆......○......☆

غوث ارسلان
ریاض

کے این واصف اور ان کی خاکہ نگاری

آج سے تقریباً ۳۵ سال پہلے کی بات ہے جب میں صحافت سے وابستہ ہوا تو صحافت میرے لئے ایک نئی دنیا تھی اور نیا تجربہ تھا۔ اس وقت حالات کچھ اور تھے وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں جو آج ہیں۔ دو اہم ادارے ہوا کرتے تھے جو اخبار کو جاری رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے۔ ایک خبر رساں ادارہ جو اخبار کو بین الاقوامی، قومی اور علاقائی و مقامی خبریں فراہم کرتا دوسرا مشتہرین یا ایڈورٹائزنگ ایجنسی جن کے ذریعہ اشتہارات ملا کرتے تھے۔ یہ ادارے اس زمانے میں کارپوریٹ سکٹر کا حصہ نہیں ہوا کرتے تھے انھیں انفرادی طور پر سرکردہ افراد چلایا کرتے تھے۔ ایک مشتہر تھے اونچے پورے، وضع دار، کم گو، خوش اخلاق، خوش لباس، وجیہہ اور نفاست پسند۔ نفاست پسندی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے اشتہاروں کے آرٹ ورک ہندستان کے مشہور فنکار سلام خوش نویس سے تیار کرواتے تھے۔ یہ صاحب عاکف ایڈ ورٹائزنگ ایجنسی کے مالک جناب خواجہ غیاث الدین عزیز جو کہ واصف صاحب کے والد بزرگوار تھے۔ لہذا واصف صاحب سے پہلے ان کے والد محترم سے تعارف ہوا۔ ان کے چچا کے ایس شفیق بھی صحافت سے وابستہ تھے، اخبارات میں کالم اور مضامین لکھا کرتے تھے۔ واصف صاحب کو صحافت ورثہ میں ملی۔ اردو کے صحافتی حلقوں میں انگریزی صحافت کے چند ایک نام معروف تھے ان میں ایک نام واصف صاحب کا بھی تھا۔ وہ کبھی کبھار ہمارے اخبار کے دفتر بھی آیا کرتے تھے کوئی خاص تصاویر ہو تو دے جاتے۔ واصف صاحب سے اس طرح سے تعارف تھا۔ میرے سعودی عرب آنے کے چند سال بعد واصف صاحب بھی آگئے یہاں پر ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہو جو آج تک قائم ہے۔ دو دہائی قبل سعودی عرب کی صورت حال مختلف تھی عوامی و ادبی سرگرمیاں دیوان خانوں تک محدود تھیں۔ ان کو وسعت دینے کی ضرورت محسوس ہوئی تو کچھ احباب نے مل کر جن میں واصف صاحب بھی شامل تھے ہندستانی بزم اردو کی بنیاد رکھی۔ اخبارات دو دن بعد موصول ہوا کرتے تھے۔ کوئی ذرائع نہیں تھے وطن عزیز اور یہاں کی خبروں سے لوگ بے خبر ہوتے تھے۔ سیاست کے ایڈیٹر ریاض تشریف لائے ہوئے تھے چوں کہ واصف صاحب کا شمار سیاست کے سابق اسٹاف میں ہوتا تھا لہذا احباب نے ایڈیٹر صاحب سے خواہش کی کہ واصف صاحب کو سعودی عرب میں اخبار کا نمائندہ مقرر کیا جائے تا کہ لوگوں میں پائی جانے والی بے خبری کا ازالہ ہو۔ وہ دن اور آج کا دن واصف صاحب بلا ناغہ مسلسل کالم لکھ رہے ہیں۔ سیاست کے علاوہ، اردو نیوز، اردو میگزین میں بھی ان کا اشتراک ہے۔

زیر نظر کتاب ذکر یاراں میں واصف صاحب کے تحریر کردہ تیس سے زائد خاکے ہیں کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ذکر یاراں اور ذکر رفتگاں۔ ذکر یاراں میں ان لوگوں کے خاکے ہیں جو ان کی حیات میں لکھے گئے اور ذکر رفتگاں میں بعد از مرگ لکھے گئے خاکے ہیں۔

واصف صاحب نے خاکہ نگاری کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ خاکہ نگاری ایسا فن ہے جس میں خاکہ نگار کے تجربات، احساسات، تاثرات، جذبات اور خیالات لفظوں سے تصویر میں ڈھل جاتے ہیں۔ اچھا خاکہ وہی ہوتا ہے جو مختصر اور جامع ہو۔

مختصر یعنی ایک ہی نشست میں اختتام پذیر ہو۔ جامع اس طرح کہ شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہو۔ واصف صاحب کے خاکے ان شرائط کو پورا کرتے ہیں۔ انھوں نے خاکہ نگاری میں اپنا اسلوب وضع کرلیا ہے۔ ان کے خاکے توصیفی، سوانحی اور اور مزاح کے امتزاج سے شگفتگی رکھتے ہیں ۔ ان کے خاکوں میں اکہرا پن نہیں پایا جاتا۔ واقعات اور لطائف سے مزاح پیدا کرتے ہیں اس معاملے میں وہ غیر مقلد نہیں مقلد ہیں۔ جہاں جہاں وہ خاکوں میں مزاح سے کام لیتے ہیں ان کا پرتو نظر آتا ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔

سعودی عرب آنے سے قبل ہی واصف صاحب اس فن میں طبع آزمائی کر چکے تھے۔ سعودی عرب میں پہلا خاکہ انھوں نے ایک دداعی تقریب میں پڑھا تھا ''ململ کے کرتے والا'' اس کی اتنی پذیرائی ہوئی کہ واصف صاحب اسی میدان کے ہوگئے۔

واصف صاحب گزشتہ ۲۵ برسوں سے پرورش لوح وقلم کر رہے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کے اب تک ۱۲۰۰ کالم شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ واصف صاحب کی آئندہ کتاب ان کے منتخب کالموں پر مشتمل ہوگی ۔ نیک ئیں اور نیک خواہشات واصف صاحب کے ساتھ ہیں۔۔

☆......○......☆

قلمی معاونین سے درخواست

● مسودات صاف اور خوش خط ارسال فرمائیں ● سطریں قریب قریب نہ ہوں ● لفظوں کو جوڑ کر نہ لکھیں جیسے:
اندنوں، ہمکو، تمکو، چاہیئکہ، انکو، رہینگے، دینگے، اسکے، انکی، اسکی، کیلئے
● نئے نام اور غیر مانوس الفاظ واضح لکھیں۔

شبیر احمد ماہرؔ، رائے گڑھ، مہاراشٹرا
موبائل: 9860783770

غزل

ہر فلسفی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا
اُلو کا پٹھا خود کو بناتا چلا گیا

جنگ خلیج سے ہوا امریکہ فیض یاب
سونے کے بھاؤ لوہا کھپاتا چلا گیا

میدان کار زار میں تنہا نہ لڑسکا
مسلم حکومتوں کو لڑاتا چلا گیا

رشیا کے ٹوٹنے سے توازن بگڑ گیا
یو ایس اے اپنی فوج بڑھاتا چلا گیا

حافظؔ کا کچھ کلام پڑھا ، ترجمہ کیا
پھر اپنے نام سے ہی سناتا چلا گیا

اُس نے کہا کہ تلخ ہے مشروبِ زندگی
مینگو فروٹی اس میں ملاتا چلا گیا

احساسِ برتری ہو کہ احساسِ کمتری
یہ کیسا روگ دل کو لگاتا چلا گیا

اُس نے کہا تھا ہم کو ادب سے سلام کر
گزرا گلی سے سر کو ہلاتا چلا گیا

عادت بری ہے مانا مگر حوصلہ تو دیکھ
اشعار چوری کر کے چھپاتا چلا گیا

وہ جارہی تھی ہوگئی کچھ ایسی دل لگی
پھولوں کی ٹوکری میں بٹاتا چلا گیا

اُس کے لبوں کا بوسہ، غضب کا تھا ذائقہ
جیسے کہ منہ میں نرم بتاشہ چلا گیا

صحرائے زندگی کی زمیں خار زار تھی
دل کے چمن سے اس کو سجاتا چلا گیا

رنج و غمِ حیات سے ماہرؔ کو ڈر ہے کیا
ہر اک قدم پہ سیٹی بجاتا چلا گیا

محمد سیف الدین
ریاض

تصویر کا دوسرا رخ

’تصویر کا دوسرا رخ‘ یہ ایک قدیم کہاوت ہے۔آپ نے بھی ضرور سنی ہوگی۔لیکن آپ کسی تصویر کو الٹ کر دیکھیں گے تو اس کے پیچھے اسٹوڈیو کا نام،تاریخ وغیرہ کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔ لیکن اگر ہم اس کہاوت کی روشنی میں کے این واصف کی شخصیت کو دیکھیں گے تو ہمیں تصویر کا دوسرا رخ بھی نظر آئے گا۔

جگر مراد آبادی نے کہا تھا کہ:

تصویر کے دو رخ ہیں جاں اور غم جاں
اک نقش چھپانا ہے ، اک نقش دکھانا ہے

کے این واصف کی شخصیت کے جن دو پہلوؤں کی ہم بات کررہے ہیں وہ دونوں ہی خالص علمی و فنی مہارت سے معمور ہیں۔ان کا ایک روپ تو صحافی و کالم نگار کا ہے جہاں قارئین ان کے الفاظ کے جادو میں کھو جاتے ہیں ۔ مزاح بھی لکھتے ہیں تو بہت ہی اعلی معیار کا جو پھکڑ پن سے پاک ہوتا ہے۔مزاح میں ان کی پسندیدہ صنف خاکہ نگاری ہے ۔ یہ ذوق بہت ہی کم لکھاریوں کے حصہ میں آیا ہے۔کیوں کہ آج کے اس پرآشوب دور میں لوگ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں اس طرح لگے رہتے ہیں کہ کسی کے حقیقت پسندانہ محاسبہ کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ایسے میں کے این واصف صاحب مزاحیہ اسلوب میں خاکہ نگاری کرتے ہوئے اس صنف میں کم از کم سعودی عرب میں ایک اتھاریٹی کی حیثیت حاصل کررہے ہیں۔

ان کی شخصیت کا دوسرا پہلو یا رخ تصویر کشی کا ہے جہاں ایک پروفیشنل فوٹو گرافر اور فوٹو جرنلسٹ کی حیثیت سے وہ ہماری زندگی کے یادگار لمحات کو اپنے کیمرے میں قید کرلیتے ہیں۔

انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ فوٹو گرافر حضرات بہت ہی خطرناک قسم کے لوگ ہوتے ہیں ۔ وہ پہلے آپ کو فریم میں لیتے ہیں ، پھر آپ کو شوٹ کرتے ہیں اور آخرکار آپ کو دیوار پر ٹا کا بھی پورا انتظام کردیتے ہیں لیکن واصف صاحب جب شوٹ کرتے ہیں تو تصویر کو کسی اخبار یا رسالے کی زینت بنادیتے ہیں ۔

وہ بہت ہی سادہ لوح اور وسیع القلب ہیں ، نہ کبھی کسی کی بے جا مخالفت کرتے ہیں نہ کسی پر تنقید ، حد تو یہ ہے کہ خود ان کی مخالفت کرنے والوں کو بھی ہمیشہ نظر انداز کردیتے ہیں کیوں کہ ان کا ماننا ہے کہ ’جہلائے کرام‘ کو کبھی منہ نہیں لگانا چاہیے!

فوٹو گرافی ہو یا رپورٹنگ یا پھر کالم نگاری واصف صاحب اپنا ہر کام اس قدر دلچسپی سے انجام دیتے ہیں کہ کام کے دوران انہیں کوئی اور بات سوجھتی ہی نہیں ، وہ اپنا کام بہت ہی انہماک سے کرتے ہیں بلکہ ہر وقت لوگوں میں خوشیاں بانٹ کر خوش ہوجاتے ہیں ۔ یہاں تک کہ خوشیوں کے ان لمحات سے کئی بار وہ خود محروم ہوجاتے ہیں ۔’ چراغ تلے اندھیرا‘ والی بات ان پر پوری طرح فٹ ہوتی ہے۔

Celebrities ، وزرا ، سفارت کاروں ، اعلیٰ عہدیداروں ، فلمی اداکاروں کو اپنے کیمرہ میں قید کرنے والے کے این واصف نے شائد ہی کسی وی آئی پی کے ساتھ اپنی کوئی تصویر بنوائی ہوگی ۔ جب سے کیمرے سے لیس موبائل فون ہر ہاتھ کی زینت بنے تب سے یار لوگوں کے فون میں واصف صاحب کی تصویریں بھی قید ہونے لگیں۔

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ سابق وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ

کے دورہ ریاض کے موقع پر یہاں مقیم سینکڑوں تارکین وطن کو ان سے ملاقات اور مصافحہ کرنے کا موقع فراہم کیا گیا تھا۔ کے این واصف نے انڈین کمیونٹی کے ان یادگار لمحات کو نہ صرف اپنے کیمرے میں قید کیا بلکہ تمام افراد کو ان کی تصویریں بھی فراہم کیں۔ حالانکہ واصف صاحب نے وزیر اعظم کے تین روزہ دورے کا مکمل کوریج کیا لیکن ان کے ساتھ ایک بھی تصویر نہیں بنوائی شائد یہی وجہ رہی ہوگی کہ جب وزیراعظم نریندر مودی ریاض کے دورہ پر آئے تو انہوں نے واصف صاحب کے کندھے سے کندھا ملا کر تصویر بنوائی۔ پتہ نہیں یہ سب مینیجڈ تھا یا اتفاق، خیر وجہ کچھ بھی رہی ہو، لیکن وزیراعظم نریندر مودی کے ساتھ لی گئی اس تصویر کو تاریخی اہمیت حاصل ہوگئی۔ جب بھی وہ تصویر ہماری نظروں کے سامنے آتی ہے تو ہمارے ذہن میں یہ شعر ابھرتا ہے:

ہمسائے میں شیطان بھی رہتا ہے خدا بھی
جنت بھی میسر ہے جہنم کی ہوا بھی

تاریخ کے ذکر سے یاد آیا کہ ہندوستان کی تاریخی عمارتوں کی تصویرکشی کے شوق نے انہیں سالانہ چھٹیوں میں آرام کرنے کی بجائے شہروں شہروں کی خاک چھاننے پر مجبور کردیا۔

حضرات آپ سب جانتے ہی ہیں کہ تصویریں دوقسم کی ہوتی ہیں۔ایک تو فوٹو اور دوسری پینٹنگ۔ کے این واصف صاحب نے پینٹنگ کے رنگوں میں کبھی اپنی انگلیاں تو نہیں ڈبوئیں لیکن پینٹرس کے ساتھ ان کا بہت گہرا یارانہ رہا ہے۔ عالمی شہرت یافتہ پینٹر ایم ایف حسین کے ساتھ طویل عرصہ تک ان کے دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔حسین صاحب ایرانی چائے کے بہت شوقین تھے اس لیے دکن کرانیکل کے دفتر کے قریب واقع ایک ایرانی ہوٹل میں اس پینٹر اور اس فوٹو گرافر کی اکثر' چائے پہ چرچہ' ہوا کرتی تھی۔ وہ تو اس دنیا سے چل بسے لیکن واصف صاحب آج بھی پینٹرس کی سنگت کو نہیں چھوڑ پائے۔

کے این واصف صاحب نے زندگی کی ۶۷ بہاریں اور خزائیں دیکھی ہیں لیکن ہم نے تو ہمیشہ انہیں نوجوانوں کی مانند چاق و چابند ہی پایا۔ ان کی تندرستی کا راز وہ خود ہی بہتر بتا سکتے ہیں کہ آخرانہوں نے کس گرنی کا آٹا کھایا ہے۔ واصف صاحب نے ثابت کردیا کہ جس عمر میں لوگ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزارتے ہیں اس عمر میں بھی انسان چست اورتندرست رہ سکتا ہے۔

انہوں نے صحافت اور فوٹوگرافی میں کئی اہم سنگ میل طئے کئے ہیں۔گریجویشن کے بعد فوٹوگرافی میں ڈپلوما کیا اور روزنامہ سیاست سے عملی صحافت میں قدم رکھا۔

۱۹۹۲ء میں سعودی عرب کو نقل مقام کے بعد آرکٹیکچرل و تعمیراتی میگزین البناء سے وابستہ ہوئے اور ۱۸ سال تک اس صحرا پر ہونے والی تعمیری پیش رفت وترقی کے نہ صرف شاہد رہے بلکہ تصویروں کے ذریعہ اسے دستاویزی حیثیت دی۔

تخلیقی ذہن اور مثبت سوچ کے حامل واصف صاحب جب یہاں سعودی عرب میں عمارتوں کی تصویرکشی کرنے لگے تو ان کے ذہن میں وطن عزیز کی تاریخی عمارتوں کا خیال آیا۔ لہذا ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں گھوم گھوم کرفن تعمیر کی شاہکار عمارتوں کو اپنے کیمرے میں قید کرلیا۔ کرناٹک، مہاراشٹرا، اترپردیش، بہار میں لی گئی تصویریں اتنی دلکش ہیں کہ انڈین ایمبیسی نے متعدد بار ریاض اور جدہ میں ان تصاویر کی نمائش منعقد کی۔

کے این واصف کے تحریر کردہ خاکوں پر مبنی کتاب' ذکر یاراں' آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ذکر یاراں قارئین اور خاص کر ان کے یاروں کی جانب سے ہاتھوں ہاتھ لی جائے۔۔

☆......○......☆

ڈاکٹر عزیر غازی
ریاض

ہر شخص تیرا نام لے ہر شخص دیوانہ ترا

(خراج خدمات وتہنیت اجرا کتاب ’ذکر یاراں‘)

کچھ لوگوں کے ساتھ خون کا رشتہ نہیں ہوتا مگر اپنوں کی خوشبو آتی ہے۔ دراصل رشتے صرف خون ہی کے نہیں ہوتے۔ خون کے علاوہ رشتے احساس کے بھی ہوتے ہیں۔ فکر وتحریک کے ہوتے ہیں۔ خیال، مذاق اور مزاج کی ہم آہنگی کے ہوتے ہیں۔ ان میں جتنا تال میل ہو رشتہ اتنا ہی مضبوط اور پختہ ہوتا ہے۔ اس رشتہ کو قائم رکھنے اور دوام بخشنے کے لیے نہ تو نشست و گفت کی ضرورت رہتی ہے اور نہ ہی طعام وتفریح کی۔ بس ایک دوسرے کا خیال، احساس اور پاس ہی اس کو استوار رکھنے کے لیے کافی ہے۔ میرا بھی واصف صاحب کے ساتھ یہی رشتہ ہے۔

میں ان سے پہلی بار ستمبر ۲۰۰۱ء میں المدینہ المنورہ میں ملا۔ مجھے اپنی نئی پوسٹنگ کے لیے الریاض آنا تھا۔ میری وداعی تقریب کی روداد واصف صاحب کے ذمہ تھی۔ بولنا تو سب کو آتا ہے۔ کسی کا دماغ بولتا ہے تو کسی کے اخلاق، کسی کا جسم بولتا ہے تو کسی کا قلم۔ واصف صاحب کا قلم اور اخلاق دونوں بولتے ہیں اور خوب بولتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زبان اور قلم سے کسی کی دل آزاری نہیں کی، ہاں مثبت تنقید ضرور کی ہے۔ نرم اور شستہ لہجہ میں تبصرہ اور تنقید ضمیر کو جگاتا ہے جب کہ سخت لہجہ انا کو جگاتا ہے۔

غیر مقیم ہندوستانیوں کے ہند اور بیرون ہند مسائل کو انہوں نے اپنی تحریروں میں ہمیشہ مقدم رکھا ہے۔ ان کے حل پیش کیے ہیں۔ ارباب حل وعقد کے سامنے اپنی قابل عمل تجاویز رکھی ہیں۔

واصف صاحب نے مزاحیہ خاکے، تبصرے، عوامی مسائل، جنرل رپورٹنگ اور کمیونٹی رپورٹنگ کی ہے۔ واصف صاحب کی تحریریں سیاست، اردو ٹائمز، انقلاب، اردو نیوز، یو پی کے دیگر اردو اخباروں اور رسالوں میں چھپتی رہتی ہیں۔ ادب اور صحافت کی دنیا میں وہ اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں جو لائق تحسین ہے۔ زیر اجرا کتاب ان کی پچیس سالہ تحریروں میں سے صرف خاکوں کا انتخاب ہے۔

دراصل سوچنے والوں کی دنیا، دنیا والوں کی سوچ سے مختلف ہوتی ہے۔ سوچنے والے اپنے بارے میں نہیں بلکہ اپنے اطراف و ماحول کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اپنے سماج اور معاشرے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ واصف صاحب بھی ان ہی سوچنے والوں میں ایک ہیں جنہوں نے اپنی ساری توانائی اور قوت بیان اپنوں کی خدمت میں صرف کی ہے۔

لوگ اچھا پڑھنے، اچھا لکھنے اور اچھا بولنے والے کو قابل سمجھتے ہیں جب کہ قابل وہ ہے جو اپنے معاشرے کا اچھا سوچے اور اس کے بارے میں بولے۔ اس کے حق میں آواز اٹھائے۔

واصف صاحب میں یہ دونوں خوبیاں بدرجہ اتم ہیں۔ انہوں نے یہ کام بے خوف ہوکر انجام کی پرواہ کیے بغیر بڑی بے باکی سے کیا ہے جس کے آپ سب شاہد اور گواہ ہیں۔

واصف صاحب ایک تجربہ کار صحافی، کہنہ مشق ادیب اور ظریف خاکہ نگار ہیں۔ اردو زبان اور بیان پر گرفت ہے۔ یہ سلیس، آسان اور عام فہم مگر فصیح اردو لکھتے ہیں اور خالص دکنی بولتے ہیں۔ دور حاضر کی نسل (جو اردو سے کم آشنا ہے) بھی ان کی تحریر آسانی سے پڑھ اور سمجھ لیتی ہے۔ قلم میں روانی ہے۔ خیال میں آمد ہے آورد نہیں۔ بات میں تسلسل اور ربط ان کی تحریر کی خوبی ہے جو پڑھنے والے کو جذب کر لیتی ہے۔ قہقہہ وہی ہے

جسے نچوڑ دیں تو آنسو نکلیں۔ان کے قہقہے اسی زمرے کے ہیں۔

ظرافت اور سفلی مذاق میں بال سے بھی باریک فرق ہوتا ہے۔ذرا سا توازن بگڑا اور بات رکیک ہوگئی۔واصف صاحب اس فرق کو خوب سمجھتے ہیں۔ان کی گفتگو اور تحریروں میں صرف اور صرف مزاح کی چاشنی ملتی ہے۔طنز سے گریز ان کا مزاج اور خاصہ ہے۔

واصف صاحب نے پچھلے ۱۰۰ سے ۴۰۰ سال پرانی عظیم اور نابغۂ روزگار عمارتوں کی معماری کی ندرت اور فن تعمیر کے کمال و جمال کی نمائندہ تصویروں کی ریاض میں نمائش کی۔ان تصویروں میں انہوں نے ان عمارتوں کی ان زاویوں سے عکاسی کی جو عام ناظر کی نظر سے فنی اعتبار پوشیدہ رہتے ہیں۔ہزاروں سیاح نے اس اچھوتی نمائش کو دیکھا اور واصف صاحب کے کام کو بے حد سراہا۔ان کے لیے یہ ہندوستان کا ایک نیا اور اچھوتا تعارف تھا۔کسی غیر مقیم ہندوستانی کی بیرون ملک یہ پہلی نمائش تھی۔

واصف صاحب نے اپنی زندگی میں سینکڑوں مشاہیر کی عکاسی کی اور اخباروں میں ان کے پروگراموں کی روداد بھیجی مگر خاکساری اور انکساری کا یہ عالم کہ خود اپنی ایک بھی تصویر ان کے ساتھ نہیں بنائی۔خود نمائی اور خودستائی اور سیلفی کے اس دور میں ایسی مثال اور نہیں ملتی۔

واصف صاحب اسم باسمی ہیں۔نجیب یعنی خاندانی،اصل نسل کا،شریف، بھلا مانس، بزرگ محترم اور معزز۔واصف یعنی صفت بیان کرنے والا،تعریف کرنے والا۔۔

یہ چند کلمات واصف صاحب کی شخصیت کا اجمالاً خدوخال مرتب کرتے ہیں اور ان کی خدمات کا مرکز اور نچوڑ ہیں۔

☆......○......☆

ہنس مکھ حیدرآبادی

فون:7013351543

عقد گرمی میں جو ہوا اپنا
سر کے سہرے سے سر پھرا اپنا

جب ہو بیگم ردیف کی صورت
تنگ ہوگا ہی قافیہ اپنا

کھیر ہی پی سکا میں دعوت میں
گھر پہ بھول آیا چوکڑا اپنا

موقع ملتے ہی گھس گئے مچھر
جب بھی حیرت سے منھ کھلا اپنا

لی ترنم کی داد لوگوں سے
شعر تھا جب کہ پُھس پُھسا اپنا

آئی اے ایس ہے ماتحت اُس کا
نام تک جو نہ لکھ سکا اپنا

ملکیت تھی کبھی جو شاہوں کی
وہ حویلی ہے راستہ اپنا

ساری دنیا میں سچ کہوں ہنس مکھ
سب سے اچھا ہے انڈیا اپنا

......☆......

کے این واصف

حسن غفور

ہندوستان میں سرکاری محکموں میں رشوت خوری ایک عام سی بات ہے اور کچھ محکمے رشوت خوری کے لیے بہت زیادہ معروف بھی ہیں جن میں محکمہ پولیس ایک ہے۔ اب تو عوام کی نظر میں پولیس اور رشوت لازم وملزوم سے ہوگئے ہیں۔ ہماری سوسائٹی نے مجموعی طور پر رشوت کو قبول بھی کرلیا ہے۔ اب رشوت لینا اور دینا ہمارے دفتری نظام کا حصہ ہوگیا۔ رشوت خوری کے مشہور سرکاری محکموں سے، جن میں محکمۂ پولیس بھی شامل ہے، لوگوں کا جب سابقہ پڑتا ہے تو لوگ رشوت دینے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرکے ان محکموں کی سیڑھیاں چڑھتے ہیں لیکن جیسے دنیا میں اچھے اور بُرے دونوں طرح کے انسان بستے ہیں ویسے ہی اس بدنام زمانہ محکموں میں بھی کچھ اچھے اور دیانتدار افسران یا کارکن بھی ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے محکمہ پولیس میں ایسے ہی ایک مثالی، دیانتدار، راست باز اور انسانی خدمت کے جذبہ کے ساتھ پولیس کی ملازمت کرنے والے اعلیٰ عہدیدار حسن غفور (آئی پی ایس) سابق ڈائرکٹر جنرل پولیس مہاراشٹرا بھی تھے، جن کا پچھلے دنوں صرف 63 سال کی عمر میں ممبئی کے بریج کنیڈی اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ انھیں شدید دل کا دورہ پڑا تھا۔۔

بالی ووڈ کی ہر دوسری فلم میں ممبئی پولیس کے غیر انسانی سلوک، بے ایمانی، رشوت خوری اور ضمیر فروش پولیس عہدیداروں کو پیش کیا جاتا ہے۔ روشنیوں کے شہر ممبئی میں حسن غفور پولیس کے ایک ایسے اعلیٰ عہدیدار تھے جن کی ایمانداری، بے لوث خدمات اور جذبۂ خدمتِ خلق سے ہر شخص متاثر تھا۔ حسن غفور حیدرآباد کے ایک بہت ہی متمول اور خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ حسن غفور نے پولیس کی ملازمت صرف اور صرف عوامی خدمت کے جذبہ کے تحت اختیار کی تھی۔ حسن غفور کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ پولیس کے محکمہ میں کام کرنے کے باوجود حد درجہ ایماندار اور نیک نفس انسان تھے۔ بتایا گیا کہ وہ حکومت سے تنخواہ کے نام پر صرف ایک روپیہ ماہانہ علامتی طور پر حاصل کرتے تھے اور ان کی تنخواہ کی باقی رقم پولیس ویلفیر فنڈ میں جمع ہوجاتی تھی، جسے محکمہ پولیس میں کام کرنے والے ضرورت مندوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جاتا تھا۔ اس نیک صفت عہدیدار جس کو محکمہ سے سبکدوش ہوئے کوئی دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا، کے انتقال کی خبر پر ساری ممبئی پولیس نے دُکھ اور غم کا اظہار کیا۔ حسن غفور کی موت کو پولیس میں ہر شخص نے اپنا ذاتی نقصان سمجھا۔ اس خبر نے محکمہ کے ادنیٰ و اعلیٰ ہر عہدیدار کی آنکھ نم کی۔ حسن غفور کی خدمات اور حُسن سلوک کو یاد کرکے انہیں والہانہ خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اخباری اطلاع کے مطابق ان کے تحت کام کرنے والے کرشن پال رگھو ونشی کمشنر پولیس ضلع تھانہ نے کہا کہ میں اپنے آپ کو خوش سمجھتا ہوں کہ میں نے حسن غفور صاحب کے ساتھ کام کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنے تعزیتی پیام میں مزید کہا کہ میں نے حسن غفور کے ساتھ کام کرکے محسوس کیا کہ ان کا ریکارڈ بالکل صاف و شفاف تھا اور وہ اپنے ماتحت افسروں اور پولیس والوں کے ساتھ بہترین اور مثالی سلوک روا رکھتے تھے۔ ان کی رحلت کی خبر سے محکمہ پولیس میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ ایسا پولیس افسر ممبئی پولیس کو کبھی نہیں ملے گا۔

حسن غفور سے میرا شخصی تعارف 1980ء کی ابتدا میں ان کے چھوٹے بھائی علی خواجہ کے ذریعہ ہوا تھا۔ علی خواجہ میرے بہت ہی قریبی دوست تھے جو اس زمانے میں ایک تعمیراتی کمپنی کے مالک تھے۔ اس کے علاوہ علی خواجہ Political Whip Hyderabad کے نام سے ایک انگریزی ہفتہ وار بھی شائع کرتے تھے اور یہی ہفتہ وار علی خواجہ سے ہمارے ربط ضبط اور دوستی کا ذریعہ تھا۔ اس زمانے

میں ہمارے علاوہ شعیب ربانی (سابق کارٹونسٹ دکن کرانیکل اور سیاست)، جے ایس افتخار (روزنامہ ہندو)، جی ایس واسو (اکنامکس ٹائمس)، پربھاکرن وغیرہ میدانِ صحافت میں نووارد تھے اور بڑی لگن اور چاؤ سے علی خواجہ کے اس ہفتہ وار کے لیے کام کرتے تھے۔ علی خواجہ نے اس زمانے میں ایک نئی گاڑی خریدی۔ علی نے ایک دن پروگرام بنایا کہ اس کار کے ذریعہ کہیں تفریح پر جایا جائے۔ اس زمانے میں حسن غفور صاحب مہاراشٹرا کے ضلع بلڈھانہ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوا کرتے تھے۔ طے پایا کہ بلڈھانا جائیں گے۔ علی خواجہ نے اس سفر کے لئے ہمارے علاوہ ایم اے باسط صاحب (سابق ڈائرکٹر جنرل آف پولیس آندھراپردیش)، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال ایڈیٹر ماہنامہ شگوفہ کو ساتھ چلنے کے لیے تیار کیا۔

میرے استادِ محترم ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اِن دنوں ادائیگی عمرہ و زیارت مدینہ منورہ کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب آئے ہوئے تھے اور فی الحال مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں۔ کل فون پر گفتگو کے دوران انھوں نے حسن غفور سے اپنے دیرینہ مراسم اور اُن کی اچانک موت پر اپنے گہرے رنج اور اس پر اپنے احساسات کا تفصیلی طور پر اظہار کیا۔ اس دوران ڈاکٹر کمال سے ہم نے اپنے بلڈھانہ کے یادگار سفر کا ذکر کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ اس سفر میں اپنی کسی خانگی مجبوری کی وجہ سے لحہ آخر میں اپنا پروگرام منسوخ کیا تھا اور ہمارے ہم رکاب نہ ہوسکے تھے۔

بلڈھانہ ریاست مہاراشٹرا کا ایک پہاڑی علاقہ ہے اور بے حد خوبصورت اور پُرفضا مقام ہے۔ یہاں ایک پرانی طرزِ تعمیر کی شاندار کوٹھی ہے۔ جو حسن غفور صاحب کی قیام گاہ تھی جہاں ہم تمام نے کوئی ایک ہفتہ قیام کیا اور بیگم و حسن غفور صاحب کی مثالی مہمان نوازی کے مزے لوٹے۔ تاریخی اجنتہ اور ایلورہ کی گھپاؤں اور ضلع بلڈھانہ کے حدود میں واقع ساری تفریح گاہوں کی سیر کی۔ نیز ان ایام کی شب بیداریاں مختلف موضوعات پر گفتگو خصوصاً حسن غفور اور باسط صاحب کے درمیان خیالات کا ٹکراؤ اور دلچسپ مباحثے، ان نشستوں کے یادگار لمحے آج بھی ہمارے ذہن میں ہیں۔ حسن غفور اور باسط صاحب آئی پی ایس کے ایک ہی بیچ سے تعلق رکھتے ہیں۔

حسن غفور کا تعلق حیدرآباد کے ایک باوقار اور مشہور و ممتاز علمی گھرانے سے تھا۔ آپ مہاراشٹرا کے سابق چیف سکریٹری اور معروف مزاح نگار خواجہ عبدالغفور (مرحوم) کے بڑے فرزند تھے۔ حسن غفور کا تعلق آئی پی ایس کے 1974ء بیچ سے تھا۔ انھوں نے بمبئی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ آپ نے ریاست مہاراشٹرا میں مختلف اہم عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ نومبر 2008ء میں ممبئی پر ہوئے دہشت گرد حملوں کے وقت حسن غفور ممبئی کے پولیس کمشنر کے عہدہ پر فائز تھے۔ وہ شہرت اور نام و نمود سے ہمیشہ دور رہتے تھے۔ انھوں نے ممبئی دہشت گرد حملوں کے دوران یہ کہہ کر Bullet Proof Vest نہیں پہنا کہ آپریشن میں شریک سینکڑوں سپاہی ہیں جن کے پاس Bullet Proof Vest نہیں ہے۔ انھوں نے کمشنر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پولیس کمشنر کی روایتی ذاتی سکیورٹی برائے نام کردی تھی۔

حسن غفور ممبئی کے دوسرے مسلم پولیس کمشنر تھے۔ ان سے قبل سید مجید اللہ 1962ء سے 1965ء میں ممبئی کے پولیس کمشنر متعین رہے۔ حسن غفور 31 ڈسمبر 2010ء کو بحیثیت ڈائرکٹر جنرل آف پولیس (Anti Corruption Bureau) کی حیثیت سے اپنی 36 سالہ مثالی خدمات سے سبکدوش ہوئے تھے اور ممبئی میں سکونت پذیر تھے۔

ہمارے 1992ء میں سعودب عرب منتقل ہونے کے بعد سے علی خواجہ اور ان کے دیگر رشتہ کے بھائیوں آرکیٹکٹ عطا حسین انجم، رفعت حسین وغیرہ سے ہمارا گاہے ماہے رابطہ رہا ہے۔ ویسے علی خواجہ خود ایک عرصہ پہلے حیدرآباد چھوڑ کر بنگلور جابسے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حسن غفور کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ ان کے لواحقین کو اس سانحہ پر صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

۲۵-مارچ-۲۰۱۲ء سیاست

☆......○......☆

کے این واصف

جہان ادب کا شہریار

اردو ادب کے کوہسار فلک بوس پروفیسر شہریار کو ادب کے اعلیٰ ترین اعزاز ''گیان پیٹھ ایوارڈ'' سے نوازے جانے کا اعلان ایسے وقت ہوا جب کہ وہ مملکت سعودی عرب میں موجود ہیں۔ اس طرح سعودی عرب میں مقیم اہل اردو کو اپنے محبوب شاعرو شہریار سخن کو سب سے پہلے شخصی طور پر مبارک باد پیش کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ سفارت خانہ ہند ریاض کے زیر اہتمام پروفیسر شہریار کے اعزاز میں تہنیتی تقریب کے انعقاد کی اطلاع دیتے ہوئے دو روز قبل میرے کرم فرما ڈاکٹر حفظ الرحمٰن نے مجھ سے کہا کہ آپ کو اس تقریب میں شرکت کرنے کے ساتھ ساتھ پروفیسر شہریار پر ایک تعارفی خاکہ بھی پڑھنا ہوگا۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور خاکہ لکھنے کی حامی بھر لی۔ اپنی حیثیت سے بڑی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد ایک طرف تو پیٹ میں تتلیاں اڑنے لگیں تو دوسری طرف دل میں خوشی کے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ بلکہ ہم اتنے خوش تھے کہ شائد خود شہریار صاحب گیان پیٹھ ایوارڈ پا کر اتنے خوش نہ ہوئے ہوں گے۔ جب ہماری خوشی ہمارے پیٹ میں سما نہ پائی تو ہم نے اس بات کا ذکر اپنے ایک رفیق کار سے کیا جس پر انھوں نے کہا کہ واقعی پروفیسر شہریار جیسی عظیم ہستی پر خاکہ لکھنے سے آپ کی عزت تو بڑھ جائے گی لیکن آپ کو یہ ذمہ داری دینے والوں نے شائد پروفیسر شہریار کی عزت کا کوئی خیال نہیں رکھا۔!

دوسرے روز صبح جب ہم خاکہ لکھنے بیٹھے تو نہ صرف ہمیں بلکہ ہمارے قلم کو بھی پسینے آنے لگے۔ دربار شہریار میں ہماری سٹی گم تھی۔ سوچا کہ اس خاکہ نگاری کا ارادہ ترک کردیں اور ہتھیار دال دیں۔ مگر دل کا اصرار تھا کہ خاکہ لکھا جائے اور دماغ اپنی کم مائیگی کا اعتراف کر رہا تھا۔ دماغ نے دل کو سمجھاتے ہوئے کہا ''لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل'' تو دل نے جواب دیا ''لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے''۔ آخر کار ہم نے دل کی ہی مانی اور پھر سے فیل قلم پر سوار ہوگئے۔

پروفیسر شہریار کو ہم جرائد و رسائل کے ذریعہ طویل عرصہ سے جانتے ہیں اور ان کی شاعری کے مداح بھی رہے ہیں۔ پروفیسر شہریار کا ہمارے شہر سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ وہاں ان کے عزیز ترین احباب رہتے ہیں۔ پروفیسر شہریار حیدرآباد آتے جاتے رہتے ہیں لیکن ہماری بدنصیبی کہ ہم پچھلے کئی برسوں سے حیدرآباد مہمان کی طرح جاتے ہیں اسی لیے حیدرآباد میں کبھی ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ سفارت خانہ ہند کے سالانہ مشاعرے کے طفیل پانچ سال قبل ریاض میں پہلی مرتبہ ان سے شخصی طور پر ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ لیکن یہ مختصر سی ملاقات ان کی شخصیت پر ایک بھرپور خاکہ لکھنے کے لیے کافی نہیں۔ مگر آج کے دور میں کسی مصروف شخصیت کا تعارفی خاکہ لکھنا بہت زیادہ مشکل بھی نہیں رہا۔ خدا بھلا کرے انٹرنیٹ کے موجد کا کہ آج ہر معروف شخصیت کے مکمل کوائف ایک click کے ساتھ کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

سامعین کرام ویسے پروفیسر شہریار کی شخصیت محتاج تعارف بھی نہیں۔ لیکن روایت کی تکمیل کی خاطر لیجیئے پروفیسر شہریار کا ایک مختصر تعارف پیش ہے۔

پروفیسر شہریار کا اصل نام کنور اخلاق محمد خان ہے۔ آپ ۱۶ جون ۱۹۳۶ء کو آنولہ ضلع بریلی، یوپی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ہردوئی میں حاصل کی۔ ۱۹۵۶ میں علی گڑھ آئے۔ ۱۹۶۱ میں اردو میں ایم اے کیا۔ ۱۹۶۶ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے جہاں سے ۱۹۹۶ میں پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ تین سال رسالہ ''اردو ادب'' اور ہفتہ وار ''ہماری زبان'' کے شعبہ ادارت سے وابستہ رہے۔ ۱۹۶۵ میں آپ کا پہلا

مجموعہ کلام ''اسم آعظم'' شائع ہوا۔۱۹۷۰ میں ''ساتواں در'' ۱۹۷۷ میں ''ہجر کے موسم'' ۱۹۸۵ میں ''خواب کا در بند ہے'' ۱۹۹۵ میں '' نیند کی کرچیں'' ۲۰۰۴ میں ''شام ہونے والی ہے'' شائع ہوئے۔ دیونا گری میں آپ کی آٹھ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ نیز آپ کی کتابوں کے انگریزی،فرانسیسی، جرمن کے علاوہ بنگلہ، مراٹھی اور تلگو زبانوں میں ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ پروفیسر شہریار فرانس، اٹلی، ماریشس اور امریکہ کے ادبی اجتماعات میں اردو اور ہندوستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ دبئی، مسقط،سعودی عرب اور پاکستان کے مشاعروں میں متعدد بار شرکت کر چکے ہیں۔

پروفیسر شہریار اردو اکیڈیمی دہلی، یوپی، غالب انسٹیٹیوٹ، ساہتیہ اکیڈیمی، بھاشا سمیتی بہار، یحیٰ منیری انعام، مدھیہ پردیش کا اقبال سمان،فراق سمان اور کئی تہذیبی اور ادبی انعامات واعزازات حاصل کر چکے ہیں۔ساہتیہ اکیڈیمی کے اردو بورڈ کے دس سال رکن رہے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تحقیقی رسالے ''فکرونظر'' کی آٹھ سال ادارت کی۔ حیدرآباد سے ''شعروحکمت'' کے نام سے شائع ہونے والے رسالے کی اشاعت میں پچھلے کئی سال سے پروفیسر مغنی تبسم کی معاونت کررہے ہیں۔

ہندوستان کے کئی رسالے آپ کے فن اور شخصیت پر گوشے شائع کر چکے ہیں۔کئی یونیورسٹیوں میں آپ پر تحقیقی مقالے لکھے جاچکے ہیں اور لکھے جاتے رہیں گے۔

آپ نے اپنے ادبی سرمایہ سے کچھ بالی ووڈ کو بھی دیا ہے۔ آپ کے لکھے ہوئے فلمی گیتوں نے بے حد مقبولیت حاصل کی لیکن آپ بالی ووڈ کی فلموں میں گیت لکھنے یا ممبئی منتقل ہونے کی طرف راغب نہیں ہوئے۔ صرف چند فلموں میں گیت لکھے شائد اس لیے کہ اردو جاننے والی اس نسل کو بھی اپنے نام سے متعارف کرادیں جو اردو زبان صرف بول اور سمجھ سکتی ہے۔شہریار نے چند ہی فلموں کے گیت لکھے جن میں فلم گمن (۱۹۷۸) اور امراؤجان (۱۹۸۱) کے گانے بے حد مقبول ہوئے۔فلم گمن کا گانا '' سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے'' یہ گانا ۷۰ کی دہائی میں بہت مقبول تھا۔ لوگوں کو سینے میں جلن کا ورد کرتے دیکھ کر ایک فارماسیوٹیکل کمپنی نے GELOCIL گولی بازار میں لادی۔ ۱۹۸۱ میں فلم ''امراؤجان'' ریلیز ہوئی اس فلم کے گانوں نے تو سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ یہ فلم جب علی گڑھ شہر میں ریلیز ہوئی تو AMU کے طلبا تھیٹر پر ٹوٹ پڑے۔اور کہتے ہیں کہ دوسرے روز کچھ منچلے طلبا نے ہاسٹلس کے واش رومس کی دیواروں پر لکھا ''اس انجمن میں آپ کو آنا ہے بار بار دیوار و در کو غور سے پہچان لیجیئے''۔

کہتے ہیں کہ اگر شاعر بہت زیادہ پڑھا لکھا ہو تو اچھے شعر کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔مگر اس تعلق سے خود شہریار کے ایک جگری دوست کا خیال ہے کہ ''پڑھا لکھا آدمی تو کوئی بھی شریفانہ کام کرسکتا ہے،شاعری کیوں کرے''۔

لیکن شہریار صاحب بہت پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اچھے شعر بھی کہتے ہیں۔اور مشاعروں میں بھی بے حد پسند کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ آج کل شاعروں کی دو قسمیں ہوگئی ہیں ایک شاعر اور دوسرے مشاعروں کے شاعر۔دوسرے یہ کہ آج کے مشاعروں میں جہاں شعرا گلا پھاڑ پھاڑ کر شعر سناتے ہیں اور اپنے اشعار سے زیادہ اپنی آواز سے سامعین کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں ایسے ماحول میں بھی پروفیسر شہریار اپنے احساسات کو سامعین پر پھینک نہیں مارتے بلکہ دھیمی آواز اور نرم وگداز لہجے میں اپنے اشعار پیش کرتے ہیں داد وتحسین بھی حاصل کرتے ہیں۔

آخر میں شہریار کے چند شعر آپ کی نذر کرکے اپنی بات ختم کروں گا۔

؎ یہ آگ ہوس کی ہے جھلس دے گی اسے بھی
سورج سے کہو سایہ دیوار میں آئے

؎ ان کے پیچھے نہ چلو ان کی نہ کرو
سائے پھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے

؎ سیاہ رات نہیں لیتی نام ڈھلنے کا
یہی تو وقت ہے سورج تیرے نکلنے کا

۳-اکتوبر-۲۰۱۱ سیاست

کے این واصف

وہ جارہا ہے کوئی۔۔۔۔

میرے بہت اچھے دوست انجینئر عبدالحمید صاحب پر خاکہ لکھنے بیٹھا تو اچانک ذہن میں فیض کا مصرع گونجا'' وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے''۔ قلم ، میدان قرطاس پر ابھی اگلا قدم بڑھانا چاہتا تھا کہ خرد نے ٹوکا اور کہا میاں یہ مصرع حمید صاحب پر صادق نہیں آتا کیونکہ حمید صاحب نے نہ یہاں '' شب غم گزاری'' نہ کسی کی محبت میں دونوں جہاں ہارے۔ انھوں نے تو یہاں اپنی ''راحت جاں'' کے ساتھ ''شب راحت'' گزاری ہے۔ حمید صاحب نے یہاں کچھ ہارا بھی نہیں بلکہ ان کے حصہ میں ہمیشہ جیت ہی جیت رہی۔ پھر میرے ذہن میں میرے عزیز ترین دوست میر یوسف علی کا ایک شعر آیا جو اس موقع کے لیے نہایت موزوں و مناسب لگا۔ یوسف علی نے زندگی کا بڑا حصہ ایران اور کویت میں گزارا اور ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے اہل وعیال کے ساتھ کینیڈا میں چین کی بانسری بجا رہے ہیں۔ متذکرہ شعر یوں ہے:

غضب کی چال تھی ہم نے تو چاپ بھی نہ سنی
جو مڑ کے دیکھا تو اے میرؔ پھر شباب نہ تھا

میر یوسف کا یہ شعر خلیجی ممالک میں طویل عرصہ گزار کر واپس جانے والے تمام غیرملکیوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ حمید صاحب بھی یہاں اپنی عین جوانی میں آئے تھے اور ۴۱ سال جیسا طویل عرصہ گزار کر لوٹ رہے ہیں۔ سعودی عرب میں کام کرنے والے اسے ہمیشہ اپنا دوسرا وطن گردانتے ہیں۔ مگر وہ ہی لمبا عرصہ یہاں گزاریں ایک دن انھیں یہاں سے لوٹنا ہی پڑتا ہے۔

حمید بھائی میرے ان احباب میں سے ہیں جن سے میری شناسائی یہیں ریاض میں ہوئی۔ ربع صدی سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ان سے تو تکار والی بے تکلفی نہ سہی مگر ہمارے مراسم کافی بے تکلفانہ ہیں۔ ہم دونوں ایک ہی شہر کے رہنے والے ہیں۔ اور ہماری عمروں میں بھی انیس بیس کا ہی فرق ہوگا۔ اب اس میں انیس کون ہے اور بیس کون یہ پھر کبھی طے کرلیں گے۔ حمید صاحب اور ہمارے درمیان علیک سلیک کی ابتدا حارہ (ریاض کا ایک محلّہ) کی ایک پان کی دکان سے شروع ہوئی۔ حمید صاحب پان کھانے کو نشہ کرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طرح میں اور وہ ایک ہی نشہ آور دکان یا میکدے کے گاہک تھے۔ اور اکثر اس میکدے سے ''وہ آتا تھا کہ ہم نکلے'' والا معاملہ تھا۔ پھر ان سے باضابطہ ملاقاتیں ''الریاض ڈیولپمنٹ اتھاریٹی'' کے آفس میں ہونے لگیں۔ جہاں وہ ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے اور ہم بحثیت صحافی ADA سے ریاض کے نئے پروجکٹ کی جانکاری حاصل کرنے جایا کرتے تھے۔ کچھ روز حمید بھائی پان کی دکان پر نظر نہیں آئے ہم نے اپنے ایک ہم مشرب سے حمید بھائی کی غیر حاضری کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ حمید صاحب وہی دنوں میں پان کھاتے ہیں جن دنوں ان کی فیملی ریاض میں نہیں ہوتی۔ تو ہم نے ان صاحب سے کہا کہ یہ ہوتی ہے نیک صفت اور خاندانی آدمی کی بات کہ فیملی نہ ہو بھی تو صرف منہ لال کرتے ہیں۔

حمید صاحب ایک معزز ، دین دار ، تعلیم یافتہ اور زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں حاصل کی اور NIT ورنگل سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ دو سال مانیرو ڈیم کے پروجکٹ پر کام کیا۔ ستر کی دہائی میں ہر نوجوان کے سر میں خلیجی ممالک جانے کا سودا سوار رہتا تھا۔ حمید صاحب نے بھی سرزمین لیلیٰ جانے کا من بنا لیا اور 1977 میں سعودی عرب منتقل ہوئے۔ ابتدا میں دمام میں آرمکو کے کسی پروجکٹ پر چھ سال کام کیا۔ سعودی عرب میں جب ذرا گردن ٹھہری تو چھلانگ لگا کر

ریاض آئے اور ''الریاض ڈیولپمنٹ اتھاریٹی'' ADA جیسے باوقار ادارہ سے منسلک ہوئے۔ جہاں انھوں نے کوئی پینتیس سال جیسا طویل عرصہ خدمات انجام دیں۔ محنت اور قابلیت سے ترقی کے زینے طے کرتے ہوئے پلاننگ انجینئر، کانٹریکٹ اڈمنسٹریٹر، پروجکٹ منیجر اور پروجکٹ ڈائریکٹر جیسی اعلیٰ ذمہ داریوں کو بحسن خوبی نبھایا۔ مملکت میں کسی غیر ملکی کا ایک نیم سرکاری ادارے میں اتنا لمبا عرصہ ٹکے رہنا اپنے آپ میں ایک بڑا امتیاز اور کارہائے نمایاں ہے۔ ADA نے صحرا نما ریاض کو پچھلی چار دہائیوں میں ایک عالمی معیار کا ایسا ترقی یافتہ شہر بنایا جس کا شمار دنیا کے بہترین شہروں میں کیا جاسکتا ہے۔ شہر ریاض کی اس تعمیر و ترقی میں حمید صاحب نے بھی اہم رول ادا کیا ہے جس کے نقوش آنے والی کئی دہائیوں تک قائم رہیں گے۔ یہاں مجھے محمود شاہد کا ایک شعر یاد آرہا ہے جو انجینئرز کی ترجمانی کرتا ہے۔

ہم ہیں صحرا کے مکانوں سے ملانے والے
ہم سے سیکھے کوئی جینے کا سلیقہ لوگو

محمود شاہد دمام میں ایک Interior Decoration کمپنی میں کام کرتے تھے۔ حضرات میں حمید صاحب پر خاکہ لکھنے میں مصروف تھا کہ WhatsApp کا سندیس آنے کی صدا آئی۔ اسکرین پر نظر ڈالی تو پیام تھا کہ ''جوڑوں کا درد جوڑے ہی جانتے ہیں کنواروں کو اس کا کیا علم'' پھر میز پر پڑی نوٹ بک جس میں ہم نے اپنی معلومات کے لیے حمید صاحب کے شخصی کوائف لکھ رکھے تھے، جس پر لکھی ان کی شادی کی تاریخ دیکھی تو پتہ چلا کہ حمید بھائی پچھلے 39 سال سے جوڑوں کے درد کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اللہ اس پرانے درد کو دراز کرے اور کوئی نیا درد نہ دے۔ حمید صاحب سعودی عرب کو کنوارے آئے تھے اور اب یہاں سے ایک بیگم تین بچے اور فی الحال چھ پوتے پوتیوں کے بھرے پرے خاندان کے سربراہ بن کے لوٹ رہے ہیں۔ بیگم اور بچوں کی تعداد تو وہی رہے گی بے شک ناتے نواسوں میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے۔ حمید صاحب کے فرزند بلال حمید اپنے والد کی طرح انجینئر ہیں اور کینیڈا میں مقیم ہیں۔ جب کہ آپ کی دونوں لڑکیاں اسماء اور ثناء ڈاکٹر ہیں اور امریکہ میں اپنی اپنی زندگیوں میں خوش ہیں۔ اس طرح حمید صاحب اپنی تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہیں اور شادی کے ے میں بیگم فرحینہ کے ساتھ قید بے مشقت کاٹ رہے ہیں۔ اب یہ جوڑا باقی ماندہ زندگی ہندوستان اور کینیڈا میں بسر کرے گا۔

حضرات ریاض شہر میں میٹرو ریل کا جو جال یا جارہا ہے اس کی وجہ سے پچھلے کوئی چار سال سے شہر کی بیشتر سڑکیں بند کردی گئی ہیں۔ یا تو کہیں انھیں یک رخی بنادیا گیا ہے یا راستہ تبدیل کرکے سڑک کو کسی اور روڈ سے ملادیا گیا ہے۔ اب پتہ نہیں میٹرو سے کون اور کب اردو میں سفر کرے گا مگر چار سال سے شہر کے لوگ انگریزی میں suffer کررہے ہیں۔ ہم نے اپنے ایک رفیق کار سے گزشتہ روز آفس سے غیر حاضری کا سبب پوچھا تو بولے ان دنوں سڑکوں کا جو حال ہے اس کے نتیجے میں مجھے کل آفس پہنچنے کی کوشش میں بھٹکتے بھٹکتے آدھا دن نکل گیا۔ تو میں نے سوچا کہ باقی آدھا دن گھر واپس پہنچنے میں لگایا جائے تاکہ شام گھر تو کم از کم وقت پر پہنچ جائیں۔ کیونکہ شام گھر تاخیر سے پہنچنے کی جوابدہی آفس میں غیر حاضری کی جوابدہی سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔

حضرات ریاض کی ان سڑکوں کا یہ حال جنھوں نے کیا ہے ان میں سے ایک سرغنہ ہمارے انجینئر عبدالحمید صاحب بھی ہیں۔ ہم نے اس سلسلے میں سوال کیا کہ آخر عوام کو یہ تکلیف کتنے دن اٹھانی پڑے گی۔ تو انھوں نے مسکرا کر کہا آپ لوگ اس تکلیف کو ''دردسر'' نہیں بلکہ ''دردزہ'' سمجھ کر برداشت کریں۔ کیونکہ اس تکلیف کے بعد راحت اور خوشی آئے گی۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے یہ ''دردزہ'' ہی سہی لیکن اتنا لمبا؟۔ پھر ہمارا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ آپ ہمیں دردزہ میں مبتلا کرکے خود یہاں سے جارہے ہیں۔ کم از کم ''خوشی'' آنے تک تو ٹھہرتے۔ مگر انھوں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

حمید صاحب فطرتاً بڑے حلیم الطبع واقع ہوئے ہیں۔ ہم نے کبھی انھیں جھلاتے، اونٹنے نہیں دیکھا۔ انھیں خودنمائی کی عادت

ہے نہ نام ونمود کی خواہش۔ سماجی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں مگر بڑی خاموشی کے ساتھ۔ یعنی وہ نیک کام بھی اتنے ڈھکے چھپے انداز میں کرتے ہیں کہ لوگ آج کل گناہ کرتے ہوئے بھی اتنے محتاط نہیں رہتے۔ انسانی خدمت کا جذبہ ان میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے، جو انھیں ورثہ میں ملا ہے۔ آپ کے والد محترم عبدالرشید صاحب، سابق میونسپل کمشنر جو اپنے آپ میں ایک انجمن ہیں اپنی کبرسنی کے باوجود اب بھی دن رات خدمت خلق و خالق میں مشغول رہتے ہیں۔ عبدالرشید صاحب ''الحق ایجوکیشن سوسایٹی'' کے بانی رکن اور جنرل سکریٹری ہیں۔ اس سوسائیٹی کے تحت ایک اسکول چلتا ہے۔ اور سوسائٹی نے تلنگانہ کے اضلاع میں اب تک 125 مساجد تعمیر کیے ہیں۔ حمید صاحب اب اپنے والد کے اس مشن کو آگے بڑھانے پر وقت دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

حضرات، حمید صاحب ایک دولت مند ترین آدمی ہیں۔ لفظ دولت کے ساتھ ہمارے ذہنوں میں کاغذ کے وہ ٹکڑے ہی آتے ہیں مگر اس کے علاوہ انسان کو بہت کچھ حاصل ہے جس کی وقعت ان کاغذ کے ٹکڑوں سے بہت زیادہ ہیں۔ جیسے ہمیں جو علم حاصل ہے وہ دولت ہے، اچھا ذریعہ معاش یا اکل ہلال دولت ہے۔ اچھے دوست دولت ہیں، سمجھدار بیوی دولت ہے، قابل اور اطاعت گزار اولاد دولت ہے، صحت مند زندگی دولت ہے۔ یہ ساری دولتیں حمید صاحب کو میسر ہے۔ ہاں جو سوئیز بنک میں ان کی دولت ہے اس کا مجھے علم نہیں!

حمید صاحب ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے باوجود بہت سادگی پسند انسان ہیں۔ کسی سے ملنے میں نہ تکلف برتتے ہیں نہ اپنے آپ کو محفلوں سے دور رکھتے ہیں۔ لوگوں کی تو مدد کرنا ان کی فطرت میں داخل ہے۔ ایک خدا ترس اور کنبہ پرور انسان ہیں۔ اور ہر نیک نفس اور شریف انسان کی طرح دل میں خوف الٰہی و اہلیہ رکھتے ہیں۔

حمید صاحب سماجی خدمات کے علاوہ اردو کی ترقی و ترویج کی کاوشوں سے بھی جڑے رہتے ہیں۔ ہندوستانی بزم اردو ریاض کے بانی رکن اور کچھ عرصہ سے اس بزم کے صدر بھی ہیں۔ آپ اردو ٹوسٹ ماسٹرس کلب کے صدر بھی رہ چکے ہیں اور دیگر فلاحی اور پرفیشنل تنظیموں سے وابستہ ہیں۔ انھیں ان کی سماجی خدمات کے عوض کئی تنظیموں کی جانب سے اعزازات بخشے گئے۔ پچھلے یوم جمہوریہ کی تقریب میں آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سفیر ہند عزت مآب احمد جاوید نے ایمبیسی کی جانب سے آپ کو ایک مومنٹو بھی پیش کیا۔

حضرات آپ میں سے بیشتر کو علم ہوگا کہ دنیا میں ایک قدیم روایت ہے شہر کی چابی حوالے کرنے کی۔ یعنی کسی بھی ملک کا سربراہ اپنے ملک یا بیرون ملک کے کسی شہر کے دورے پر جاتا ہے تو اس شہر کا میئر ایرپورٹ پر اسے ایک چابی پیش کرتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ یہ شہر آپ کے حوالے ہوتا ہے۔ اور جب وہ اپنا دور مکمل کر کے واپس ہوتا ہے وہ چابی شہر کے میئر کو واپس کر کے جاتا ہے۔ اس بات کا ذکر یہاں کرنے کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے ہفتہ ADA میں حمید صاحب کے اعزاز میں ایک الوداعی تقریب کا اہتمام ہوا جس میں شہر ریاض کے میئر انجینئر طارق الفارس نے بھی شرکت کی۔ ریاض شہر سے وداع لینے والے حمید صاحب سے ہم یہاں پوچھنا چاہیں گے کہ کیا ریاض کے میئر آپ سے چابی واپس لینے تو نہیں آئے تھے۔۔

حضرات حمید صاحب نے میئر کو چابی حوالے کی یا نہیں ہم اس بات کو یہیں چھوڑتے ہیں۔ مگر ہم ہندوستانیوں کے لیے ایک فخر کی بات ہے کہ حمید صاحب کی وداعی تقریب میں شہر کے میئر نے شرکت کی اور انھیں تہنیت پیش کی اور تحایف سے نوازا۔ ہم یہاں پھر ایک بار یہ بات دہرائیں گے کہ سعودی عرب میں کسی خارجی باشندے کو اس طرح کا اعزاز حاصل ہونا بہت بڑی بات ہے۔ اور ہندوستانی کمیونٹی اس بات پر ہمیشہ فخر کرے گی۔۔۔۔۔۔۔

حمید بھائی زندہ باد۔

۱۱-نومبر-۲۰۱۸ء سیاست

☆……○……☆

کے این واصف

ولی تنویر ایک فرزانہ ولی

''ولی'' کے لغوی معنیٰ سے تو ہم سب واقف ہیں، یعنی ایسا انسان جسے قرب الٰہی حاصل ہو۔ مگر ہم عام طور سے ولی ایسے بندے کو بھی کہتے ہیں جسے دنیا و مافیہا کی خبر نہ ہو، کسی چیز کا ہوش نہ ہو، کسی دھن میں دیوانگی کی حد تک کھویا رہے۔ ایسے افراد کو مادی معاملات میں بھی کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ دنیا چاہے انہیں دیوانہ تصور کرنے لگے۔ انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن کسی ولی کی دیوانگی میں کچھ فرزانگی شامل ہوجائے تو اسے ''ولی تنویر'' کہتے ہیں۔۔!

تاریخ شاہد ہے اردو ادب میں ایسے ہزاروں، لاکھوں ادیب و شاعر گزرے ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقات سے اردو ادب کو مالا مال کیا، مگر ذاتی زندگی میں ہمیشہ تنگ دست رہے۔ اپنے قارئین و سامعین کو اپنی تخلیقات سے ذہنی آسودگی بخشی مگر خود کبھی آسودہ حال نہ ہوئے۔ اردو ادب کے ساتھ دیوانگی سے جڑے افراد کے حالات آج بھی اردو کے کل سے کچھ مختلف نہیں ہیں، لیکن جن ادیبوں، شاعروں نے اپنی ضروریات اور ذمہ داریوں کو اپنے ادبی شوق کے برابر اہمیت دی، وہ ادیب و شاعر دونوں محاذ پر کامیاب رہے۔ ولی تنویر بھی ایسے ہی خوش نصیبوں میں ایک ہیں۔ سنا ہے کہ ہمارے استاد محترم اور ماہنامہ شگوفہ کے ایڈیٹر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب کی تجویز و مشورے پر ولی تنویر نے اڈورٹائزنگ کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ ابتدا میں انہوں نے ماہنامہ شگوفہ کے لیے بھی کافی اشتہارات فراہم کئے اور پھر اپنے کاروبار کو وسعت دی اور شہر کے روزناموں کے لیے بھی کام کرنے لگے، پھر دیکھتے ہی دیکھتے ولی تنویر اس میدان کے سکندر ہوگئے۔

محمد ولی الدین جو اپنے قلمی نام ولی تنویر سے معروف ہیں سے میری شناسائی 1977 ء سے ہے، جب میں اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنے والد (خواجہ غیاث الدین عزیز) کی اڈورٹائزنگ ایجنسی ''عاکف کمرشیل اڈورٹائزنگ کمپنی'' سے جڑا تھا۔ ولی تنویر اس وقت اشتہارات کی دنیا میں اپنے قدم جما چکے تھے اور میں اس میدان میں نو وارد تھا چونکہ ہم دونوں کا تعلق ایک ہی پیشہ سے تھا لہٰذا ہم ایک دوسرے کے حریف کے طور پر میدان میں تھے۔ آپس میں ہم رفیق ضرور تھے مگر پیشہ ورانہ رقیب (روسیاہ نہیں) بھی تھے۔ ایک تو ولی تنویر مجھ سے سینئر تھے اور دوسرے وہ ایک عرصہ سے ہمارے والد کے ملنے والوں میں سے رہے تھے۔ لہٰذا ہم دونوں کو اس بات کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ اس لئے ہماری پیشہ ورانہ چشمک ہمیشہ حدودِ ادب میں رہی۔ آپس میں نہ کبھی بات بڑھی نہ بات بند ہوئی۔

میں اڈورٹائزنگ کی دنیا میں مختصر عرصہ ہی رہا۔ اس دوران میں نے فوٹو جرنلزم میں ایک ڈپلوما کورس کیا اور اخبارات سے جڑ گیا۔ میں نے روزنامہ سیاست میں بحیثیت اسٹاف فوٹو گرافر مختصر عرصہ تک کام کرنے کے بعد انگریزی روزنامہ دکن کرانیکل اور پھر انڈین ایکسپریس سے منسلک ہوگیا اور سعودی عرب منتقل ہونے تک انڈین ایکسپریس ہی سے جڑا رہا جس کی وجہ سے اردو والوں سے، اردو کی محافل اور جرائد سے میرا تعلق ٹوٹ سا گیا۔ مگر میں ہر روز اردو اخبارات کے تقریباً ہر اشتہار کے نیچے قوسین میں تنویر لکھا ہوا ضرور دیکھتا تھا۔ مگر ان سے شاید ہی کبھی ملاقات ہوتی تھی۔ پھر میں 1992 ء میں سعودی عرب منتقل ہوگیا۔ اس طویل عرصہ میں سال میں ایک بار وطن کا پھیرا ہوتا کوئی 30، 35 دن قیام کے ساتھ، جس کی وجہ سے پرانے شناسائیوں اور احباب سے ملاقاتوں کے سلسلے کم ہوگئے۔ شہر حیدرآباد تعمیر و ترقی کے بعد اب مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں اپنے پیدائشی شہر میں

بے گانہ سا ہو گیا ہوں۔

پچھلے سال اپریل میں ہم چھٹی پر تھے۔ مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ باغ عامہ میں محفل افسانہ کی خبر پڑھی۔ ادبی محافل میں شرکت کی اپنی ذاتی دلچسپی کے علاوہ ہمارے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ محفل میں احباب سے ملاقات ہوگی، پرانے تعلقات کی تجدید ہوگی اور ہم اس محفل میں پہنچ گئے۔ ہم ابھی ہال کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ سامنے سے اپنے رفیق دیرینہ اور نامور افسانہ نگار ولی تنویر صاحب کو آتے دیکھا۔ انہیں دیکھ کر جتنی مسرت ہوئی اتنی ہی حیرانی بھی۔خوشی اس بات کی تھی کہ کوئی تین دہائیوں سے زائد عرصہ کے بعد انہیں دیکھا تھا اور حیرانی اس بات کی تھی کہ جس شخص کو از حد متحرک، تندرست و توانا دیکھا تھا وہ آج عصائے پیری کے سہارے چل کر آ رہا ہے۔قریب آئے تو بڑی گرمجوشی اور شفقت سے ملے ۔ بڑی دیر تک ہم درختوں کے سایے میں کھڑے باتیں کرتے رہے۔آخر میں انہوں نے ایک اور تفصیلی ملاقات کے لیے ان کے گھر آنے کی دعوت دی۔ چند روز بعد مقررہ وقت و تاریخ پر ہم ان کے مکان پہنچے۔انہوں نے اس محفل کے لیے دیگر چند حضرات جن میں ڈاکٹر عقیل ہاشمی، پروفیسر وہاب قیصر، رؤف خیر وغیرہ شامل تھے کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ یہ محفل مختصر مگر پر اثر تھی اور کیوں نہ ہو اس محفل کا اہتمام ولی تنویر نے جو کیا تھا۔جنہیں ادبی محافل بپا کرنے کا نصف صدی کا تجربہ جو ہے۔ولی تنویر برسوں ادارہ محور ادب کے روح رواں رہے جس کی محافل میں حیدرآباد کی بڑی بڑی ادبی ہستیوں نے شرکت کی تھیں۔

ایک سال بعد ہم پھر حیدرآباد آئے ۔ ولی تنویر صاحب کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے فوری فون پر رابطہ کیا اور اطلاع دی کہ ''تاریک اجالے'' کے عنوان سے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔میں نے ان سے کتاب حاصل کر کے کہا اردو ادب پہلے ادب برائے ادب تھا، پھر ادب برائے زندگی ہوا اور آج کل یہ ادب برائے رسم اجرا ہے۔یعنی پہلا مضمون، افسانہ یا غزل ہوتے ہی تخلیق کار مجموعہ شائع کرنے اور اس کی تقریب رونمائی کا منصوبہ تیار کرنے لگتے ہیں اور آپ ہیں کہ نصف صدی سے افسانہ نگاری کرنے کے بعد اب جا کر پہلا مجموعہ شائع کروایا ۔اس پر ولی تنویر نے کہا کہ ایک تو بزنس کی دوڑ دھوپ نے کبھی دم لینے نہیں دیا اور جب کچھ فرصت ملی تو دیکھا کہ برسوں سے ایک لکڑی کی صندوقچی میں رکھے پچاس سال کے ادبی سرمایہ کو حشرات الارض نے چاٹ لیا ہے۔ پھر اس کے بعد بڑی تلاش، بڑی جستجو کے بعد جو کچھ یکجا کیا جا سکا وہ ''تاریک اجالے'' کی صورت میں آپ کے ہاتھ میں ہے۔ویسے اب اردو کے اوراق کو حشرات الارض ہی چاٹتے ہیں کیونکہ آج کل اردو والے انگریزی زیادہ چاٹتے ہیں شائد وہ اسی میں زیادہ ذائقہ محسوس کرتے ہیں۔

میں ولی تنویر صاحب سے کوئی چار دہائیوں سے واقف ہوں۔مگر ان کے مجموعہ میں ڈاکٹر عقیل ہاشمی، پروفیسر وہاب قیصر، رؤف خیر، ڈاکٹر ایم اے مجید، محمود سلیم اور خود ولی تنویر کے پیش لفظ سے ان کی شخصیت کے کئی پردے اٹھے اور میں ان کے بارے میں بہت سی باتیں جان سکا جن سے میں واقف نہیں تھا۔ میں نے یہاں جو باتیں رقم کی ہیں وہ صرف ولی تنویر صاحب سے متعلق میری شخصی رائے اور کچھ پرانی یادیں ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس مجموعہ یا ان کی فن افسانہ نگاری پر کچھ اظہار خیال کرنے کا اہل نہیں پاتا۔ کہتے ہیں جو بچھو کے کاٹے کا منتر نہیں جانتا اسے سانپ کے بل میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے ۔ ولی تنویر صاحب 50 سال سے افسانہ نگاری کر رہے ہیں جبکہ ہم 50 سال سے صرف افسانے پڑھ رہے ہیں۔ابھی ہم اس کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرنے یا افسانے کی تکنیک یا اس کے معیار کو پرکھنے وغیرہ کی اہلیت اپنے اندر نہیں پاتے۔ ہاں اردو ادب کے تین، چار بڑی اور معتبر ہستیوں نے اس کتاب میں ولی تنویر اور ان کے فن کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے میں اس کی بھر پور تائید کرتا ہوں۔

۱۱-مئی-۲۰۱۴ سیاست

☆......○......☆

کے این واصف

مزاح کا رابن ہڈ، مصطفیٰ علی بیگ

مصطفیٰ علی بیگ سے میری شناسائی نصف صدی کا قصہ اور دوستی ربع صدی کی بات ہے۔ میں اپنی ابتدائی عمر سے مصطفیٰ علی بیگ کو اسٹیج پر پرفارم کرتے ہوئے دیکھتا رہا ہوں۔ لیکن ان سے قربت تب بڑھی جب میں ان کا پڑوسی بنا۔ اردو میں ایک لفظ ہے' یارِ غار' جس کے مرادی معنی سے آپ ہم بخوبی واقف ہیں۔ لیکن یارِ غار سے عام معنی میں گہری دوستی سے ہی مراد لی جاتی ہے۔ مصطفیٰ علی بیگ سے میری دوستی گہری ضرور ہے لیکن میں انہیں یارِ غار نہیں بلکہ' یار پہاڑ' کہتا ہوں۔ وہ اس لیے کہ حیدرآباد کے علاقے بنجارہ ہلز کے جس پہاڑ پر مصطفیٰ علی بیگ کا بسیرا ہے انہی کے پڑوس میں کبھی میرا بھی ٹھکانہ تھا۔

مصطفیٰ علی بیگ بیک وقت قلم کار، صدا کار اور اداکار ہیں۔ لیکن یہ سب ان کے شوق ہیں، ذریعہ معاش نہیں۔ شاید' کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے' پر یقین کرتے ہوئے انہوں نے بھی ملازمت اختیار کی اور وہ ہاؤزنگ کارپوریشن میں جنرل منیجر کے عہدے تک ترقی کی اور چند برس قبل اپنی خدمات سے سبکدوش ہوئے۔ شاید یہ شعر بھی انہوں نے اسی وقت کہا ہوگا۔

ہیں منسٹر اسّی اسّی سال کے
ہم کو 58 میں پنشن آلرائٹ

کہتے ہیں سرکاری ملازم گھر سے آفس آنے کی تنخواہ اور آفس سے گھر جانے کے لیے وظیفہ (پنشن) لیتے ہیں۔ مصطفیٰ علی بیگ آفس سے گھر آچکے اور حکومت سے انہیں گھر بٹھانے کا ہرجانہ وصول کر رہے ہیں۔ عام مشاہدہ یہ ہے کہ انسان ریٹائر ہونے کے بعد پرہیز اور پرہیزگاری کی طرف زیادہ مائل ہوجاتا ہے۔ اولاد کی دنیا اور اپنی آخرت سنوارنے میں لگ جاتا ہے لیکن مصطفیٰ علی بیگ کا معاملہ ذرا مختلف ہے انہوں نے اس قدیم روایت کو الٹ دیا ہے۔ مصطفیٰ علی بیگ نے اپنے دو ہونہار اور نیک سیرت فرزندان کو سرزمین مقدس میں بسا دیا اور خود یورپ اور امریکہ میں مشاعرے لوٹنے میں مصروف رہتے ہیں اور مغربی ممالک کے دوروں سے جب واپس لوٹتے ہیں تو فوراً سعودی عرب آجاتے ہیں اور عمرے کی سعادت حاصل کرلیتے ہیں۔ شاید اسی طرح وہ اپنے اعمال نامہ کا توازن برابر کرلیتے ہیں۔ حضرات! میرا مطلب وہ نہیں ہے جو شاید آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں تو صرف آنکھوں کے گناہ کی بات کررہا تھا۔ کیا کیجئے کہ یورپ اور امریکہ میں آنکھوں کے آگے آجانے والے مناظر پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ بڑی عمر کے لوگ ان مناظر کو اپنی بینائی پر زور ڈال کر پہلے اچھی طرح دیکھ تو لیتے ہیں پھر فوری لعنت بھی بھیج دیتے ہیں۔۔

چومکھی شخصیت کے مالک مصطفیٰ علی بیگ کا دورہ سعودی عرب بھی ہمہ مقصدی ہوتا ہے۔ یعنی حرمین شریفین کی حاضری بچوں کے ساتھ وقت گزارنا، عزیز و اقارب سے ملاقاتیں اور ادبی محافل میں شرکت کرنا، قہقہے لٹانا اور مشاعرے لوٹنا۔ مصطفیٰ علی بیگ نے لوٹ مار کا یہ کام طالب علمی کے زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی سے شروع کیا تھا۔ پھر حیدراباد سے اسے قومی سطح پر پھیلایا اور اب مزاح کے رابن ہڈ مصطفیٰ علی بیگ لوٹنے لٹانے کا یہ کام زیادہ تر بین الاقوامی سطح پر کررہے ہیں۔

شعرا کی اس لوٹ کھسوٹ کو معروف شاعر شوکت جمال نے اپنے ایک قطعہ میں بہت خوب باندھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سویرا ہوتے ہی شاعر پہ یہ ستم ٹوٹا
پولیس لے گئی تھانے وہاں اُسے کوٹا
کہا کہ مال برآمد کرا ابھی فوراً

سنا ہے رات کو تو نے مشاعرہ لوٹا

خیر یہ تو شوکت جمال صاحب کا اعتراف تھا، پتہ نہیں اس سلسلے میں مصطفیٰ علی بیگ صاحب کا کیا تجربہ ہے۔

مصطفیٰ علی بیگ ریڈیو پر صدا کاری، اسٹیج اور ٹی وی پر اداکاری اور مشاعروں میں اپنی مزاحیہ شاعری کے ذریعے کم و بیش 50 سال سے عوام کے دلوں پر راج کرر ہے ہیں۔ ان کی شخصیت میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کی ہمہ جہت صلاحیتوں پر وقت اور حالات کی گرد کبھی جمنے نہیں پائی۔ نیز میں انہیں پچھلے 45 سال سے تقریباً اسی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ یعنی ان کی ظاہری حالت میں اس لمبے عرصہ میں بہت معمولی فرق آیا ہے۔ لگتا ہے انہوں نے اپنی بڑھتی ہوئی عمر پر Stay Order لے رکھا ہے۔ ان کے ناظرین و سامعین میں کچھ ڈھل گئے اور کچھ چل بسے۔ لیکن چشم بد دور مصطفیٰ علی بیگ نے گزشتہ صدی میں قہقہے بانٹتے پھرنے کا جو سفر شروع کیا تھا وہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہنوز جاری ہے۔ مصطفیٰ علی بیگ نے اپنے ایور گرین رہنے کے بارے میں ایک واقعہ سنایا تھا۔ امریکہ میں منعقدہ ایک مشاعرے کے اختتام پر ایک باریش صاحب جن کے بالوں میں سیاہی کم اور سفیدی زیادہ تھی، نے قریب آ کر بڑے ادب سے انہیں سلام کیا۔ مصطفیٰ علی بیگ نے ان کے سر پر چھائی بزرگی کو دیکھتے ہوئے بڑے احترام سے ان سے مصافحہ کیا۔ جس کے بعد وہ صاحب یوں گویا ہوئے 'بیگ صاحب میں حیدرآباد کے اعظم پورہ ہائی اسکول میں آپ کا شاگرد رہا ہوں۔ مصطفیٰ علی بیگ حیرانی کے ساتھ بزرگ نما شاگرد کو دیکھ ہی رہے تھے کہ انہوں نے مزید کہا کہ بے شک آپ نے مجھے نہیں پہچانا ہوگا۔ لیکن آپ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے اس لیے میں نے آپ کو با آسانی پہچان لیا۔ بیگ صاحب کے شاگرد کے ساتھ کھڑی ان کی بیگم نے حیرت سے اپنے شوہر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ یہ آپ کے استاد ہیں؟ درحقیقت تو آپ ان کے استاد نظر آ رہے ہیں۔ پھر آہستہ سے ٹھیٹ حیدرآبادی لہجہ میں کہا 'آپ تو بالکل ڈھلک گئے مگر آپ کے استاد تو اب بھی فقط ''چنچہ'' ہیں۔

گو کہ اردو ادب میں مزاح نگاری کو دوسرے درجہ کا ادب گردانتے ہیں۔ حالانکہ مزاح نگاری ادب کی ایک مشکل ترین صنف ہے۔ ضمیر جعفری مزاح نگاری کو صدق بیانی کہتے ہیں۔ انہوں نے کسی محفل میں اپنی آپ بیتی بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'مجھے بھایا تو ایک ذرا سا تل تھا اور شادی ساری کی ساری لڑکی سے کرنی پڑی'۔ جب سامعین نے اس جملے پر قہقہہ بلند کیا تو کہنے لگے 'حضرات میں نے تو ایک حقیقت بیان کی'۔ صدق بیانی ہمت کا کام ہے۔ مزاح نگار میں اپنے آپ پر ہنسنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ اب اوپر کہی گئی ضمیر جعفری صاحب کی بات ہو یا مصطفیٰ علی بیگ کے یہ اشعار:

بچپن سے میری آنکھوں کے دو، دو ہیں زاویے
کوئی کھڑا رہا نہ اکیلا Before Me

یا انہی کا ایک اور شعر۔

ذرا سی بات ہے او GOD کردے
مری آنکھوں میں تھوڑا سا کریکشن

ہر بات میں مزاح کا پہلو نکال لینا مصطفیٰ علی بیگ کا خاصہ ہے۔ مصطفیٰ علی بیگ اس سے قبل جب ریاض آئے تھے تو جناب افضل سنائی نے اپنے فارم ہاوز پر ان کے اعزاز میں ایک محفل کا اہتمام کیا تھا۔ کئی ایکڑ پر پھیلے ہوئے افضل سنائی صاحب کے اس فارم ہاوز میں ایک پولٹری یونٹ بھی ہے جس میں چھ لاکھ مرغیاں پالی ہوئی ہیں۔

مصطفیٰ علی بیگ نے اس محفل میں کلام سنانے سے قبل سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے دنیا کے مختلف ممالک میں سامعین کی چھوٹی بڑی محافل میں کلام سنایا ہے لیکن افضل سنائی صاحب کی بدولت آج مجھے یہ موقع بھی میسر آیا ہے کہ میں آج چھ لاکھ مرغیوں کے بیچ کلام سنانے جا رہا ہوں۔ اس طرح مصطفیٰ علی بیگ کے کلام سنانے سے قبل ہی محفل میں قہقہے بلند ہوا ٹھے۔ ہر بات میں مزاح کا پہلو نکال لینا مصطفیٰ علی بیگ کا

خاص وصف ہے ۔ حیدرآباد کے اس منچلے اور چھیل چھبیلے فنکار نے صدا کاری، اداکاری اور اپنی اینگلو اردو شاعری کا سفر کوئی 50 سال قبل شروع کیا تھا۔ انہوں نے برسوں پہلے جو انگریزی زدہ اردو شاعری شروع کی تھی یہی زبان آج ہماری سوسائٹی کی عام بول چال کی زبان بن گئی ہے ۔ آج اردو بولنے والوں کی عام گفتگو میں ہر تیسرا لفظ انگریزی کا ہوتا ہے ۔یعنی مصطفیٰ علی بیگ کی شاعری کی زبان آج ہمارے گھروں ، بازاروں اور محافل کی عام زبان ہے ۔ اس لیے مصطفیٰ علی بیگ کی شاعری کو سمجھنے میں عام لوگوں کو کوئی دشواری پیش نہیں آتی ورنہ آج اردو میں گفتگو کے دوران کوئی ذرا سا مشکل لفظ کہہ دے تو مخاطب اس کا مطلب پوچھ بیٹھتا ہے اور لامحالہ کہنے والے کو اس کا متبادل انگریزی لفظ بتانا پڑتا ہے۔ مشاعروں میں تو اکثر لوگ اپنے دائیں بائیں بیٹھے احباب سے اشعار کا مطلب پوچھتے نظر آتے ہیں ۔ ایک مشاعرے میں شاعر نے جب یہ شعر پڑھا۔

اک سمندر نے آواز دی
مجھ کو پانی پلا دیجئے

شعر سن کر ایک صاحب نے اپنے دوست سے پوچھا یار یہ سمندر کا پانی مانگنا کا مطلب کیا ہوا؟ اس پر ان کے دوست نے کہا حد ہوگئی یار اتنی آسان سی بات نہیں سمجھتے ۔ وہ میاہ صحہ مانگ رہا ہے (عربی میں میاہ صحہ Mineral Water کو کہتے ہیں)۔ شاید مصطفیٰ علی بیگ نے اردو کے مستقبل کے سامع کو ذہن میں رکھ کر برسوں پہلے اینگلو اردو شاعری شروع کی اور آج تک کامیابی کے ساتھ مشاعرے لوٹ رہے ہیں اور قہقہے لٹا رہے ہیں ۔۔

(یہ مضمون تنظیم ہم ہندوستانی کے زیر اہتمام ریاض میں منعقد جشن مزاح کے موقع پر پڑھا گیا تھا ۔ جس کے لیے مصطفیٰ علی بیگ کو تنظیم کی جانب سے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا ۔)

۱۵- جون-۲۰۰۸ سیاست

☆......○......☆

کے این واصف

ڈاکٹر یوسف اعظمی

کالج کے پہلے روز سارے طلباء کلاس میں آ بیٹھے اور چند لمحوں بعد ایک لڑکا یا نوجوان کہیئے کلاس روم میں بڑے ادب سے داخل ہوا۔ چونکہ پہلا دن تھا طلبا ایک دوسرے سے کم واقف تھے ۔ ہم نے دیکھا کہ یہ نوجوان جو کلاس روم میں داخل ہوا تھا وہ لکچرر کی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔ ہم نے سوچا کوئی شریر طالب علم ہے جو ہم نئے لڑکوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے ۔ پھر اس نوجوان نے اپنے ہاتھ میں موجود کتابیں پروفیسر کی میز پر رکھ دیں اور کچھ بولے بغیر طائرانہ نظروں سے کلاس کا جائزہ لینے لگا۔ ہم نے سوچا یہ لڑکا پروفیسر کی اچھی اداکاری کر رہا ہے ۔ پھر ہمارے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ یہ واقعی لکچرر ہے ، یا ایسا تو نہیں کہ ڈے کالج کے لکچرر ایوننگ کالج میں کلاسیس لینے کے لیے اپنے لڑکے کو تو نہیں بھیج دیتے ہیں کیوں کہ ایوننگ کالج میں پڑھنے کا یہ ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ ابھی ہمارا ذہن ان اندیشوں اور قیاس آرائیوں میں ہچکولے کھا رہا تھا کہ اچانک اس نوجوان نے کہا کہ چلیے ہم پہلے ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں ۔ آپ لوگ اپنا نام بتائیں۔ ہم نے کھڑے ہو کر ان سے کہا میاں آج پہلا دن ہے ۔ ہم ایک دسرے سے متعارف ضرور ہوں گے لیکن پہلے آپ ہمارے ساتھ آ کر بیٹھ تو جائیں ۔ ابھی کسی دم میں پروفیسر صاحب آتے ہی ہوں گے ۔ جواباً اس نوجوان نے ہماری طرف گھورتے ہوئے غصہ سے کہا آپ بیٹھ جائیے اور کوئی پروفیسر آنے والا نہیں ہے ۔ میرا نام یوسف اعظمی ہے ۔ میں ہی آپ کا انگریزی کا پروفیسر ہوں ۔ ہم اپنا سا منہ لے کر بیٹھ گئے مگر اب بھی ہمارا ذہن ماننے کو تیار نہیں تھا کہ یہ لڑکا ہمارا پروفیسر ہوسکتا ہے لیکن جب یوسف اعظمی صاحب نے لکچر شروع کیا تو چند لمحوں ہی میں ہم قائل ہوگئے کہ یقیناً یہ انگریزی کا پروفیسر ہے ۔۔

کے این واصف

زندہ جاوید

''اس حسینہ نے اپنی ابتدائی عمر حجاب میں گزاری ۔ آج یہ تیس برس کی ہے ۔ اور اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ زمانے کے شانہ بشانہ چل رہی ہے ۔ اس کا جدید پیراہن ، نیا سنگھار ہزاروں افراد کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے ۔ یہ جہاں دور حاضر کے تقاضوں کو پورا کر رہی ہے ، وہیں اپنی روایات کی پاسدار اور اسلامی اقدار کی پابند بھی ہے ۔ جو اس کی بہترین نشو ونما اور اعلیٰ تربیت کا ثبوت ہے ۔ اس کو آج ساری دنیا سے روانہ ہزاروں ای میلز وصول ہوتے ہیں ۔ اس کے توسط سے لوگ دنیا اور با ص مشرق وسطی کے سیاسی ، سماجی اور اقتصادی حالات سے آشنا ہوتے ہیں''۔ یہ جاوید حسن کے لکھے ایک مضمون (Green evolution to haute coutre) کے ابتدائی پیراگرف کا ترجمہ ہے ۔ جاوید حسن نے اس مضمون میں اخبار عرب نیوز کو ایک حسینہ سے تشبیہہ دیتے ہوئے اخبار کا اتعارف پیش کیا تھا ۔ یہ مضمون جاوید حسن نے اپنی اس کاغذی حسینہ کی تیس سالہ سالگرہ کے موقع پر لکھا تھا۔

جاوید حسن تقریباً تین دہائیوں سے صحرائے عرب کی اس لیلیٰ صحافت کی زلفوں کے اسیر ہیں ۔ جاوید حسن نے 13 دسمبر 1980ء کو اس حسینہ کے ساتھ باضابطہ عقد کیا تھا ۔ 27 سال کا یہ طویل عرصہ اس کے ساتھ ہنسی خوشی گزارا ۔ نہ کبھی رنجش نہ کبھی گلہ شکوہ ۔ لیکن پچھلے ماہ انہوں نے اچانک اس حسینہ سے قطع تعلق کی ٹھان لی ۔ حالانکہ ہم نے سنا ہے کہ حسینہ نے جاوید حسن کی کافی منت سماجت کی کہ وہ کچھ عرصہ اور اس کے ساتھ گزاریں ۔ اب پتہ نہیں جاوید حسن اپنی اس حسینہ سے اوب گئے یا ناراض ہوگئے ہیں ۔ یقیناً وہ اوب ہی گئے ہوں گے کیوں کہ جاوید حسن کو آج تک کسی نے غصہ ہوتے یا کسی سے ناراض ہوتے نہیں دیکھا ۔

انسان کا غصے میں آنا ایک فطری عمل ہے اور کہتے ہیں ہر شخص میں صبر کا ایک پیمانہ ہوتا ہے اور جب یہ پیمانہ لبریز ہوجاتا ہے تو چھلک جاتا ہے اور اس نقطہ پر انسان بھڑک اٹھتا ہے اور غصہ کرنے یا چیخنے چلانے لگتا ہے ۔ مگر لگتا ہے جاوید حسن کے صبر کے پیمانے میں کہیں سوراخ ہے ۔ اس لیے وہ نہ کبھی لبریز ہوتا ہے اور نہ چھلکتا ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ نہ کبھی جھنجلاتے ہیں اور نہ غصہ کرتے ہیں ۔ یا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جاوید حسن ہومیو پیتھی مزاج کے حامل ہیں ۔ ہومیو پیتھی دوا مریض کا منہ کڑوا نہیں کرتی ۔ بخشتے تو شفا ہی بخشتی ہے ۔ کبھی نقصان نہیں پہنچاتی ۔ یہی اوصاف جاوید حسن کے بھی ہیں وہ ہمیشہ لوگوں کے کام ہی آتے ہیں ۔ کسی کو ٹھیس پہنچاتے ہیں نا نقصان ۔۔

جاوید حسن ہمیشہ بڑے محتاط رہتے ہیں ۔ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ احتیاط کے حصار میں رکھتے ہیں ۔ چاہے وہ کھانا پینا ہو یا لوگوں سے ملنا ملانا ۔ حد تو یہ کہ وہ ہنستے بھی بڑی احتیاط سے ہیں ۔ کبھی ہنسی کو قہقہے میں تبدیل ہونے نہیں دیتے ۔ بات بھی بڑے دھیمے سر میں کرتے ہیں ۔ فون پر تو میں انہیں سن ہی نہیں پاتا ۔ اب پتہ نہیں میری سماعت کمزور ہے یا ان کی آواز ۔ جاوید حسن سے جب بھی فون پر بات ہوتی ہے تو میں بات پوری طرح سنے بغیر ہی ' ٹھیک ہے جاوید بھائی ، ٹھیک ہے جاوید بھائی کہتا رہتا ہوں ۔ اور یہ ٹھیک ہے جاوید بھائی کا ورد بے خوف وخطر اس لیے کرتا ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ جاوید بھائی نہ کبھی غلط بولتے ہیں

نہ غلط سنتے ہیں ۔ لہٰذا ان کی ہر بات پرٹھیک ہے ۔ کہہ دینے میں کوئی حرج بھی نہیں ۔۔

ایک مرتبہ کسی محفل میں ہمارے بغل میں بیٹھے ایک صاحب نے آہستہ سے 'مانک چند گٹکے' کی پڑیا ہماری طرف بڑھائی ۔ ہم نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ 'میں یہ شوق نہیں کرتا۔ کچھ دیر بعد دوسری طرف سے سگریٹ آفر ہوئی ہم نے پھر معذرت کی اور کہا کہ ہم کونوشی کے بھی عادی نہیں ہیں ۔تو فوراً ان صاحب نے کہا 'یعنی آپ میں کوئی مردانہ شوق ہی نہیں ہے'۔

جاوید حسن میں بھی اس طرح کا کوئی مردانہ شوق نہیں ہے ۔ بلکہ انہوں نے تو کھانا کھانے کی عادت بھی نہیں ڈال رکھی ہے ، کام سے فرصت ملے تو کھالیا ورنہ بس اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں ۔یعنی جاوید حسن صرف 'شراب کے شغل' کے عادی ہیں اور چوبیسوں گھنٹے اسی کے نشہ میں چور رہتے ہیں ۔

شاید جب سے من وسلویٰ بند ہوا تب سے انسان کام کررہا ہے ۔لیکن اکثریت اپنی ملازمت کوصرف تکمیل ضابطہ کر کے دن گزار دیتی ہے یا اسے ایک بوجھ سمجھ کر ڈھوتی ہے ۔ بہت کم لوگ اپنے کام یا ملازمت کوسنجیدگی ،شوق اور لگن سے کرتے ہیں ۔اگر ہم اپنے جاننے والے ایسے حضرات کی فہرست تیار کریں تو اس میں جاوید حسن سرفہرست ہوں گے ۔ جاوید حسن اپنے جاب کو صرف ذریعہ معاش نہیں سمجھتے ۔ وہ جس انہماک اور دلچسپی سے اپنا کام کرتے ہیں ایسے لوگ کم دیکھنے میں آتے ہیں ۔آپ جب بھی ان کے آفس جایئے تو انہیں کمپیوٹر کے 'کی بورڈ' پر انگلیاں چلاتے ہی پائیں گے ۔ آپ کرسی کھینچ کر بازو بیٹھ جائیں تو آہستہ سے تازہ اخبار آپ کی طرف بڑھا دیں گے اور پھر کمپیوٹر کی کھڑکیوں کی تانک جھانک میں مصروف ہوجائیں گے ۔سعودی عرب کے شعبہ صحافت میں غیر ملکیوں کی اکثریت ہے ۔اور انگریزی جرنلزم میں ہندوستانی باشندوں کی مملکت سے فی الحال دوانگریزی روزنامے شائع ہوتے ہیں ۔ 'عرب نیوز' اور 'سعودی گزٹ' تیسرا روزنامہ 'ریاض ڈیلی' تھا جو کچھ سال قبل بند ہوگیا۔

ان اخبارات میں جن ہندوستانی صحافیوں نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں ان میں شمس احسن سیفی ، کے کے نائر، ایم جی پلے، جاوید جیوانی ، رمیش بالن ، جاوید اختر ، طارق غازی ، میر ایوب علی خاں ، محمود صابری ، جوائے رافل ، حسن جعفری ، عمر شریف ، ونود مینن ، جعفر خاں ، رام کمار ، حبیب شیخ ، سراج وہاب ، فیصل علی ، رام نارائن ، پی کے عبدالغفور، غضنفر علی خاں ،سعید حیدر، شاہین نظر ، شاہد علی خاں اور بے شک جاوید حسن شامل ہیں ۔اگر یہاں میں طاہر حسین انصاری کا نام نہ لوں تو زیادتی ہوگی ۔طاہر انصاری بھی بڑے طویل عرصے سے انگریزی صحافت سے منسلک ہیں ۔ وہ یہاں کی سرکاری خبر رساں ایجنسی SPA میں نیوز ایڈیٹر کے عہدے پر فائز ہیں ۔۔

جاوید حسن بنیادی طور پر حیدرآبادی ہیں ۔لیکن بنگلور میں جا بسے ہیں ۔ ویسے برسوں سے تو شہروں ،شہروں اور ملکوں ملکوں ہی میں بھٹک رہے رہے ہیں ۔ جاوید حسن نے حیدرآباد کے مدرسہ عالیہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی ۔ نظام کالج سے گریجویشن اور عثمانیہ یونیورسٹی سے 1966 میں جرنلزم کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد فری پریس جرنل (ممبئی) میں ملازمت اختیار کی ۔ 70-1967 تک فری پریس 75-1970 تک تانڈین ایکسپریس اور ٹائمس آف انڈیا ممبئی اور 80-1975 کے درمیان کرناٹک کے محکمہ سیاحت سے منسلک رہے اور 1980 میں سعودی عرب منتقل ہوئے اور عرب نیوز سے جڑ گئے ۔۔

جاوید حسن یہاں کی محافل میں کم نظر آتے ہیں ۔ شاید وہ سوشیلائزنگ کے قائل نہیں ہیں ۔ اپنے اسائنمنٹ کے علاوہ وہ اپنے آفس کے کمرے سے باہر بہت کم نکلتے ہیں ۔اور جب نکلتے ہیں تو مملکت سے باہر نکل جاتے ہیں ۔ جاوید حسن نے اب تک 25 ممالک کے متعدد بار دورے کئے ہیں ۔ جن میں امریکہ ، آسٹریلیا ، یورپی ممالک ، جنوب مشرقی ایشیاء ، مشرق بعید کے ممالک شامل ہیں ۔ جاوید حسن لکھتے بہت ہیں لیکن بولتے کم ہیں ۔ وہ اپنا کام بڑی دیانتداری اور انہماک سے کرتے ہیں ۔ اپنی

رپورٹس اور مضامین پر بڑی محنت کرتے ہیں ۔ایک ایک لفظ ناپ تول کر لکھتے ہیں ۔ بقول کسی کے حسین عورتیں اتنی اللہ نے نہیں بنائیں جتنی میک اپ نے بنائی ہیں ۔ جاوید حسن بھی ایک اعلیٰ درجہ کے میک اپ مین ہیں ۔ بے جان اسٹوریز میں بھی جاں ڈال دیتے ہیں ۔ جاوید حسن اپنی صحت کا خاصا خیال رکھتے ہیں ۔ شوگر ، بلڈ پریشر ، جیسے عارضے آجکل بہت عام ہیں بلکہ ہماری سوسائٹی میں Status Symbol کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں ۔ایک عمر کے بعد اگر آپ کو شوگر یا بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق نہ ہوا تو سوسائٹی میں آپ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے ۔چشم بدور جاوید حسن نانا ، دادا بن گئے ہیں لیکن کسی عارضہ کو آج تک قریب پھٹکنے نہیں دیا ۔ ڈائٹ کنٹرول ایسا سخت کہ برسوں سے وزن میں ایک کیلو بھی اضافہ نہیں ہونے دیا۔

سنا ہے کہ جاوید حسن ایک دن واک کرتے ہوئے کہیں دور نکل گئے ۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شیر دوڑتا ہوا ان کی طرف آ رہا ہے ۔ جاوید حسن یہ سوچ کر اپنی جگہ خاموش کھڑے ہوگئے کہ اب جو کچھ کرنا ہے وہ شیر کو کرنا ہے ۔لہذا خاموش کھڑے رہنے میں بھتری ہے ۔شیر ان کے قریب آیا ان کے گرد دو چار چکر لگائے اور واپس جانے لگا ۔ جاوید صاحب کی رگ صحافت پھڑکی انہیں یہاں ایک اسٹوری کا چانس نظر آیا ۔انہوں نے شیر کو آواز دی اور سوال کیا ۔آپ نے لگے رہومنا بھائی فلم دیکھی ہے؟ شیر نے جواب دیا نہیں ۔تو جاوید صاحب بولے پھر یہ گاندھی گیری کہاں سے سیکھی جو ہاتھ آئے شکار کو چھوڑ کر واپس جارہے ہیں ۔شیر نے جواب دیا۔ میں گاندھی گیری سے تو واقف نہیں ہوں لیکن کیا آپ کو پتہ نہیں شیر صرف گوشت کھاتا ہڈیاں نہیں ۔ یہ کہہ کر شیر دم ہلاتا ہوا واپس ہوگیا ۔ جاوید حسن نے اپنے آپ کو slim رکھنے کے فائدے کو دیکھتے ہوئے اپنی واکنگ میں دو کیلو میٹر کا اور اضافہ کر دیا۔۔

جاوید صاحب سعودی عرب چھوڑ کر جارہے ہیں ۔ یہ تو یہاں کام کرنے والے ہر خارجی کا مقدر ہے ۔ یہاں کسی کو گرین کارڈ نہیں ملتا مگر ہر ایک کو ایک نہ ایک دن 'ریڈ کارڈ' دکھا کر میدان سے باہر کردیا جاتا ہے ۔ جاوید حسن بھی اب 27 برس بعد وطن واپس ہورہے ہیں ۔مگر جاوید حسن نے عرب نیوز کے صفحات پر جو تحریریں چھوڑی ہیں ان کے گہرے نقوش قارئین کے ذہنوں میں برسوں باقی رہیں گے ۔ نیز جاوید حسن کی عنقریب ایک کتاب شائع ہوکر منظر عام پر آئے گی اور یہ تہلکہ خیز کتاب جاوید حسن کو زندہ جاوید کردے گی ۔۔

۲۰ -اپریل- ۲۰۰۸ سیاست

☆......O......☆

قلم کار اپنی تخلیقات صرف ''ان پیج فارمیٹ'' میں ہی ای میل کریں۔ 'ورڈ' یا 'کنورڈ' کی فائل ارسال نہ کریں

کے این واصف

پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کرو گے

خاکہ نگاری کا تقاضہ ہے کہ اس میں برجستگی ، بے ساختگی اور بے باکی ہو جس کے لیے خاکہ نگار کو گستاخی کا حق نہیں تو حریت خیال تو حاصل ہونا ہی چاہئے۔ مگر خاکہ نگار اور صاحبِ خاکہ کے درمیان کسی حوالے سے حد و ادب کے تقاضے ملحوظ ہوں تو پھر خاکہ نگار کے لیے ''ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر'' کا معاملہ درپیش ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی کچھ صورتحال اس وقت میرے سامنے ہے۔ گو کہ میر احمد علی صاحب اور میرے درمیان دوستی کی سلور جوبلی ہونے کو ہے اور میں میر صاحب سے بہت زیادہ قریب بھی ہوں بلکہ ریاض میں میر صاحب سے میں جتنا زیادہ ملتا ہوں ، شاید کسی اور دوست سے ملتا ہوں گا۔ دیرینہ تعلقات اور قربت کے باوجود میں کبھی میر صاحب سے بہت بے تکلف نہ ہوسکا۔ اس کی مختلف وجوہات ہیں۔ میر صاحب مجھ سے عمر میں، علم میں، قد میں، حیثیت میں بڑے ہیں۔ میں اگر کبھی تھوڑی بہت آزادی لینے کی کوشش بھی کروں تو میر صاحب مسکراتے ہوئے کہتے ہیں ''میاں میں آپ کا بڑا بھائی ہونے کے علاوہ آپ کے اساتذہ کا بے تکلف دوست بھی ہوں، یہ سن کر میں اپنی حیثیت میں آجاتا ہوں۔

میر صاحب ان بن، رنجش، جھگڑے اور نزاعی معاملات سے دور رہتے ہیں اور اس طرح کے افراد سے اپنے مراسم بھی رکھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ اپنے احباب کو آبگینوں کی طرح برتتے ہیں۔ نہ کسی سے اونچی آواز میں بولتے ہیں، نہ کسی کی دل شکنی کرتے ہیں اور نہ کسی کو دکھ پہنچاتے ہیں۔ وہ جس سے ملتے ہیں بڑے والہانہ انداز سے ملتے ہیں۔ کوئی ان کے جذبات کا خیال رکھے یا نہ رکھے، وہ کسی کے جذبات مجروح نہیں کرتے۔ وہ ملتے بھی کم لوگوں سے ہیں۔ ہمیشہ اپنا دائرہ احباب محدود رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید وہ میر تقی میر کے اس خیال سے اتفاق رکھتے ہیں کہ

گل ہو، مہتاب ہو، آئینہ ہو، خورشید ہو میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہے

میر صاحب گرم دم جستجو ہیں کہ نہیں اس پر ہم نے کبھی غور نہیں کیا مگر وہ نرم دم گفتگو ضرور ہیں۔ وہ بات کرتے ہوئے جملے کے آخری حصے تک پہنچتے پہنچتے اتنے دھیمے سر میں چلے جاتے ہیں کہ اکثر اوقات آخری الفاظ تو سنائی ہی نہیں پڑتے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں بلکہ ''سرہانے میر کے'' بیٹھے ہیں۔

حضرات ! کتابیں، ادراک ، آگہی قوت حافظہ اور علم وغیرہ اگر دولت میں شمار ہیں تو میر صاحب دنیا کے دولت مند ترین افراد میں ایک ہوں گے۔ ان کے گھر سب سے زیادہ جو چیز نظر آتی ہے ، وہ کتابیں ہیں۔ ان کے گھر آئے مہمان کو جسم اور روح دونوں کی غذا میسر ہوتی ہے۔ ان کے گھر آنے والے مہمان کے لیے جتنی دیر میں نرگس بھابی چائے وائے کا انتظام کرتی ہیں۔ اتنی دیر میں میر صاحب مہمان کی روح کو سیر کرادیتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ میر صاحب کے گھر کوئی مہمان نہیں رہا ہوگا۔ میں ہر دو چار دن میں ان کے گھر پہنچ جاتا ہوں۔ اس کی ایک اہم وجہ میر صاحب کی بیگم کے ذائقے دار کھانے ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ عالم بالا میں عورتوں کو اُن کے پکائے ہوئے سالن بطور سزا کھلائے جائیں گے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر نرگس

بھابی دنیا و آخرت دونوں ہی جگہ مزے میں رہیں گی۔

مطالعہ کرنا، کتابیں خریدنا میر صاحب کا محبوب مشغلہ ہے۔ انہوں نے غضب کا حافظ بھی پایا ہے۔ میر صاحب نے مولانا آزاد کو سب سے زیادہ پڑھا ہے۔

حضرات ! آج کل کسی کو کسی بھی موضوع پر معلومات درکار ہوں تو وہ فوری الکٹرانک تانترک بابا گوگل سے رجوع ہوجاتے ہیں اور بے شک ''گوگل بابا'' ان کی اچھا پوری بھی کرتے ہیں لیکن اگر کسی کو مولانا آزاد پر مواد درکار ہو تو وہ گوگل کی بجائے میر صاحب سے رجوع کرے تو وہ مولانا آزاد پر گوگل سے زیادہ مواد دے سکتے ہیں کیونکہ میر صاحب نے آزاد کے لکھے سارے ذخیرے کو اپنے ذہن کی Flash Drive میں محفوظ کرلیا ہے۔ ہم نے ایسے بہت سے لوگ دیکھے ہیں جنہیں مختلف شعراء کے سینکڑوں اشعار ازبر ہوتے ہیں لیکن میر صاحب ایک ایسے شخص ہیں جنہیں آزاد کے مضامین کے صفحات زبانی یاد ہیں۔ ابوالکلام آزاد میر صاحب کی کمزوری بھی ہیں اور طاقت بھی۔ میر صاحب کسی بھی محفل میں ہوں، سلسلے گفتگو طویل ہو یا مختصر، ان کی گفتگو آزاد کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ ابوالکلام آزاد کے بارے میں میر صاحب کو جتنی معلومات ہیں اتنی معلومات شاید خود ابوالکلام آزاد کو بھی نہیں ہوں گی۔ میر صاحب نے ہائی اسکول تک تلگو میڈیم سے تعلیم حاصل کی اور اردو شوقیہ طور سے گھر پر اپنے بزرگوں سے سیکھی۔ مگر اردو میں اس درجہ قابل ہوئے کہ اب وہ اردو میڈیم سے پڑھے افراد کے بھی کان کاٹتے ہیں۔ میر صاحب کے مطالعہ میں تلگو اور اردو ادب دونوں رہتے ہیں۔ لہذا وہ ''بانکی تلنگن'' سے بھی دل بہلاتے ہیں اور اردو غزل سے بھی اٹھکیلیاں کرتے ہیں۔

میر صاحب تلنگانہ کے ضلع میدک کے ایک دینی، علمی، زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ حضرات عام طور سے بچے دنیا میں تنہا ہی آتے ہیں۔ مگر میر صاحب اپنے بھائی کے ساتھ آئے۔ یعنی میر صاحب کے بھائی میر غضنفر علی صاحب ان سے چند لمحے بڑے ہیں۔ کم عمری میں سایۂ پدری سے محروم ہوجانے کی وجہ سے ان کے بچپن سے جوانی تک کا سفر کٹھن رہا۔ مگر ہمت و حوصلے کے بل بوتے پر وہ تاریک راہوں سے اجالوں تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔

میر صاحب نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بحیثیت استاد کیا۔ انہوں نے مختصر عرصہ سکندر آباد کی قدیم درسگاہ ''اسلامیہ ہائی اسکول'' میں خدمات انجام دیں جہاں وہ بیک وقت تلگو کے ''پنتولو (استاد) اور انگریزی کے ٹیچر ہوا کرتے تھے۔ اس دور میں جب ہندوستان کی آبادیوں سے قافلوں کے قافلے عرب کے صحراؤں کی طرف کوچ کر رہے تھے، میر صاحب نے بھی اپنے عہد جوانی میں سعودی عرب کا رخ کیا۔ بزبان میر تقی میر اب ہمارے میر صاحب کا حال یوں ہے۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں
ہوگئے خاک انتہا یہ ہے

میر صاحب کوئی تین دہائیوں سے زائد عرصہ سے یہاں مقیم ہیں۔ وہ ہندوستانی اور پاکستانی کمیونٹی میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ ان میں حیدرآبادیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ حیدرآبادی تہذیب جو آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جارہی ہے، میر صاحب اس تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ میر صاحب کی عرفیت ''نواب'' ہے۔ ان کے عزیز و اقارب اور بچپن کے ساتھی انہیں نواب بھائی کہہ کر ہی مخاطب کرتے ہیں۔ گو کہ ان کا تعلق نوابی گھرانے سے نہیں مگر ان کے مزاج میں نوابیت ضرور ہے۔ شاید یہ نام کا اثر ہے۔

حضرات ایک خاتون نے اپنے شوہر سے سوال کیا کہ یہ مرد حضرات کیونکر اپنی بیوی کے ''مجازی خدا'' کہلاتے ہیں تو شوہر نے جواب دیا اس لیے کہ وہ سنتا سب ہے مگر بولتا کچھ نہیں۔ میر صاحب بھی مجازی خدا بنے مگر پڑوسی ملک جاکر۔ شاید انہوں نے ''ملک خدا تنگ نیست'' کی کہاوت پر عمل کیا ہو۔ ویسے کہتے ہیں جوڑے تو آسمانوں میں طے ہیں۔ لہذا میں یہاں تک بندان کی

نذر کر کے آگے بڑھوں گا۔

کوئی چہرہ نگاہ میں اس کی جچا ہی نہیں
جو حیدرآباد سے نکلا تو کراچی پہنچا

میر صاحب کا مطالعہ بڑا وسیع ہے اور ماشاء اللہ ان کا حافظہ بھی غضب کا ہے۔ کسی بھی موضوع پر گھنٹوں بول سکتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ کسی محفل میں کھانا serve ہونے میں تاخیر ہو جائے تو منتظمین محفل میر صاحب کو مائک پر کھڑا کر دیں۔ وہ ایک آدھ گھنٹہ آسانی سے سامعین کو روحانی غذا فراہم کر دیں گے لیکن اب مشکل یہ ہے کہ میر صاحب یہاں کچھ دن کے مہمان ہیں۔ پھر وہ حیدرآباد کے ہو جائیں گے۔ یہاں کی محفلیں ان کی شدید کمی محسوس کریں گی اور مجھے شخصی طور پر یہ لگتا ہے کہ میرے لیے ریاض شہر ویران سا ہو جائے گا کیونکہ دولت کدۂ میر میرے لیے ایک ایسا ٹھکانہ ہے جہاں میں بغیر کسی Appointment کے پہنچ جاتا ہوں اور پریشانی یہ ہے کہ اب یہ دروازہ بند ہونے کو ہے۔ خیر اب ہمیں بھی یہاں کب ہمیشہ رہنا ہے۔ اگر ملک عدم نہ گئے تو ہم بھی اپنے ملک ہی لوٹیں گے اور میر صاحب کا ساتھ پھر حاصل ہو جائے گا۔ ہمیں امید ہے کہ میر صاحب کو اہل ریاض اور میر صاحب ریاض والوں کو کبھی نہیں بھولیں گے اور ہمارے درمیان میر تقی میر کا یہ خیال کبھی بھی نہیں آئے گا کہ

وہ تجھ کو بھولے ہیں تو تجھ پہ بھی یہ لازم ہے میر
خاک ڈال، آگ لگا، نام نہ لے، یاد نہ کر

۱۵-مئی-۲۰۱۶ سیاست

☆......○......☆

منی آرڈر فارم پر مکمل پتہ و فون نمبر لکھیں اور صراحت فرمائیں کہ رقم کس لیے ارسال کی گئی ہے
منی آرڈر کی رسید اپنے پاس محفوظ رکھیں

چائے

شکیل سہسرامی
پٹنہ، بہار

ہائے کیا ذائقہ ہے چائے کا
کیا ہی اچھا مزہ ہے چائے کا

نقرئی پیالیاں ہیں چائے کی
رنگ بھی کیا بھلا ہے چائے کا

ہر کوئی پی رہا ہے چائے اب
خوب فیشن بڑھا ہے چائے کا

جتنی جی چاہے پیجیے صاحب
پورا ڈبہ رکھا ہے چائے کا

دور اس کا نہیں کوئی مخصوص
ہر زمانہ رہا ہے چائے کا

گھر سے باہر نکل پڑے ہیں لوگ
جب بھی نشہ چڑھا ہے چائے کا

وصل معشوق ہاتھ آیا پھر
کیا بہانہ ملا ہے چائے کا

کیوں شکایت ہو پھر بھتیجے سے
جب کہ عاشق چچا ہے چائے کا

مجھ کو تنہا نہ جانیے صاحب
ساتھ مجھ کو ملا ہے چائے کا

کیوں شکایت کروں میں چائے کی
کامیابی صلہ ہے چائے کا

اس کو چائے نوازتی ہے بہت
جو بھی عادی ہوا ہے چائے کا

چائے کوئی حرام چیز نہیں
مسئلہ طے شدہ ہے چائے کا

چائے نوشی نہیں ہے فرض مگر
شوق بالکل بجا ہے چائے کا

اس کی دیوانگی نہ پوچھ شکیل
جو دیوانہ ہوا ہے چائے کا

ہائے کیا ذائقہ ہے چائے کا
اچھا خاصا مزہ ہے چائے کا

دے کے خط ...... (مراسلے)

محترم کمال صاحب! آداب

میں جنوری میں چھوٹی بیٹی کے پاس دوبئی گیا تھا۔ واپسی پر رسائل اور کتب کا انبار میرا انتظار کر رہا تھا۔ سب سے پہلے میں نے شگوفہ ہی دیکھا۔ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ جو بات میں نے دس غزلوں میں کہی تھی وہ سرکار کی بندر بانٹ کی کہانی آپ نے ایک کارٹون میں ہی بتادی۔ بہت بہت شکریہ اور صاف گوئی کے لیے مبارکباد۔ باقی خیریت سب سے آداب کہیے۔

کرشن پرویز، کھرڑ، ب

نوٹ: اس کارٹون کی فوٹو کاپی میں کئی رسائل اور اخباروں کو بھیج رہا ہوں صرف عنوان میرا ہے۔ ''سرکاری فنڈوں کی بندر بانٹ''۔

محترم ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب

السلام علیکم

ارض جلال و جمال حرمین الشریفین سے خوب خوب ڈھیر ساری نیکیاں سمیٹنے کا جو موقع اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو فراہم فرمایا یہ اس کی شان کریمی ہے۔ ہم گناہگار بندے اس کا جتنا بھی شکر بجالائیں کم ہے۔ اللہ رب العزت آپ کے قیام ارض جلال و جمال کے نیک اعمال، عمرہ، جائز دعاؤں اور حاجات کو قبول فرمائے۔ آمین۔ ان شاء اللہ اس متبرک سفر کی تمام تفصیلات سے آئندہ ماہ کے شمارہ میں ضرور آگاہی ہوگی۔ شگوفہ اپریل ۲۰۱۹ گذشتہ ہفتہ باصرنواز ہوا۔ فضل جاوید صاحب کی پیروڈیوں پر مشتمل گوشہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی۔ کم وبیش ۴۲ سال قبل فضل جاوید نے کس قدر جانفشانی وعرق ریزی سے اپنی تحقیق کو عملی جامہ پہنایا اور تقریباً ۴۰ سال بعد تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں بھی چھپ چکا ہے۔ جاوید صاحب نے پیروڈی کی تعریف اور اس کے چند نمونوں کے ذریعے بہت سارے تحقیقی حقائق سے آگاہ کیا اور سیر حاصل گفتگو بھی کی۔ امتیاز وحید کولکتہ اور ڈاکٹر محمد بہادر علی ورنگل نے فضل جاوید کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کی مدلل پذیرائی کی ہے۔ جاوید صاحب کی فنی صلاحیتوں سے قارئین کو روشناس کرانے کے لیے دونوں ہی ناقدین کو صمیم قلب سے بہت بہت مبارک باد۔ ساتھ ہی مدیر شگوفہ کے ممنون ہیں کہ موصوف نے ماہ ستمبر ۱۹۷۶ء کے پیروڈی نمبر سے اس ماہ خصوصی منظوم گوشہ شامل فرما کر قارئین کو محظوظ ہونے کا موقع فراہم کیا۔ اس ماہ کے مشمولات میں شامل ۳۰ قلم کاروں کی مختلف اقسام و موضوعات کی پیروڈیاں پڑھ کر طبیعت بہت محظوظ ہوئی۔ راجہ مہدی علی خاں، دلاور فگار، سید محمد جعفری اور شاہد صدیقی کی پیروڈیوں کا جواب نہیں۔ والسلام

سید عطا اللہ شاہ

موظف اکاونٹس آفیسر

اورنگ آباد، فون 9834428159

جناب مصطفیٰ صاحب! السلام علیکم

واقعی کمال ہو بھئی!

نہ پرنٹ میں مسٹک نہ املے میں غلطی، کمال در کمال پرچہ دمک رہا ہے۔ مضامین دھک رہے ہیں۔ تصاویر چمک رہے ہیں۔ مزاحیہ الفاظ چہک رہے ہیں اور پابندی سے مل رہا ہے جو خوب سے خوب تر ہوتا جارہا ہے۔ سرورق بھی کمال ہے، جس میں جمال ہی جمال ہے۔ نمبر پہ نمبر نکل رہے ہیں۔ نریندر لوتھر نمبر تو بس انمول رہا کہیں سے بانو سرتاج صاحبہ بھی ہنستی مسکراتی نکل آئیں۔ اللہ آپ کو شگوفہ کے سر پر سلامت رکھے۔ (آمین)

سمجھ رہے تھے کہ مشکلیں اتنی پڑیں کہ آسان ہو جائیں گی۔ بعد مدت کے پتہ چلا کہ نہ ہنسی رہی نہ خوشی رہی۔ نہ سکون ملا نہ چین۔ دن اداس تو راتیں ویران، اداسیوں کے ڈھیر ہیں مایوسیوں کے گھیرے میں، باہر ہی نہیں اندر بھی خشک سالی ہے۔ لیکن آنکھوں کی نہر سوئیز برابر رواں دواں ہے۔ اس کا منبع سوکھتا ہی نہیں۔ وہم اور اندیشوں نے کہا ہے کہیں زم زم کے کنویں سے سلسلہ تو نہیں !!! عمر بھی حضرت خضر کی عنایت نہ ہو۔ کہ جئے جارہے ہیں۔ عمر بڑھ رہی ہے۔ زندگی گھٹ رہی ہے۔ حالات

افراتفری کا شکار ہیں ۔ معاشرہ اس قدر بگڑ چکا ہے کہ سچ بولنے سے پہلے خود پر لعنت بھیجنی پڑتی ہے ۔ سنگ اٹھانے سے پہلے سر عزیز کا خیال آ جاتا ہے جو یوں بھی خواہ مخواہ ہی درد دیتا ہے ۔ سوچنے یا فکر کرنے سے اب ہوتا بھی کیا ہے ؟ لیکن فضول سی باتوں کو اندرونی مغز کا محور بنالیا ہے ۔ جہاں خوش ہونا ہوتا ہے وہاں بھی روتا ہے ۔ جہاں رونا ہوتا ہے وہاں تو روتا ہی روتا ہے ۔ جہاں پہ اپنی خیر اور عافیت دونوں ہی خطرے میں نظر آتے ہیں ۔ اللہ وہ دن نہ لائے تو جانوں ۔۔

ایسے میں شگوفہ آ جائے تو پھر کیا کہنا ۔ ہونٹ جو مسکرانے کے زاویے بھول چکے ہیں ۔ ٹیڑھے میڑھے سے ہو کر کچھ کوشش کر لیتے ہیں ۔ اب تو آئینہ دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا ۔ اس روتی ہنستی صورت کی نظر جب زرسالانہ پر پڑی تو یہ زاویے بھی بدل کر فق ہو گئے ۔ اللہ آپ کے کمال کو اور بلندیوں تک لے جائے ۔ شہر کا حال یہ کہ میٹرو کے جال نے عجیب و غریب ادھورے کاموں کے ساتھ ڈھیروں ملبوں کے ڈھیر لگا دیے ہیں جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے ۔ میٹرو ٹرین تک پہنچنے کی ساری سیڑھیاں یا تو پوسٹ آفس کے سامنے سے گزر رہی ہیں یا پوسٹ باکس زد میں آ گئے ہیں جس کی وجہ سے خطوط اور منی آرڈر کی کارروائی ٹھپ ہو کر رہ گئی ہے ۔ ہر آفس کی طرح یہاں بھی نہ داد نہ فریاد یہ تو ہماری طرف کا احوال ہے ۔ اللہ جانے موسیٰ کے اُدھر کا کیا حال ہے؟

ہر نامہ بر کو سلام کرتے ، دعائیں دیتے بسر ہو رہی ہے ۔ اللہ بڑا ہے اسی مغالطے میں گذر ہو رہی ہے ۔ جانے کب اچھے دن آئیں گے ۔ !!!

اس لمبی تمہید کا مقصد و مدعا تاخیر کے لیے معافی ہے ۔ شگوفہ کے لیے 400 روپے کی مضبوط پوڑی بنا کر رکھ چھوڑی ہے مگر کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔ اگر نظر آ گئی تو دل کے بوجھ اور بے بسی سے نجات ملے ۔ دعا فرمائیں ۔

بہن قیصر کو سلام آپ کے اور شگوفہ کے لیے بہت سی مبارکبادیاں اور نیک ئیں ۔

مخلص

سعدیہ مشتاق ، حیدرآباد ۔ فون 040-24564128

محترمی ایڈیٹر صاحب ! السلام علیکم ۔

امید کہ مزاجِ گرامی شگوفہ کی طرح ہوگا کیوں نہ ہو وزارت ثقافت حکومتِ ہند کے دہلی پبلک لائبریری بورڈ نے ۲۰۱۹ ء کا اردو جرائد زمرے میں پہلا انعام عطا کیا ہے ۔ برسوں کی محنت آخر رنگ لائی ۔ بقول

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

مرحبا ! مرحبا ! یہ جریدہ ثواب دارین کا باعث بنے ۔ آمین ۔ شگوفہ کے لیے ایک چھوٹی سی نظم لکھی ہوں شائد کہ آپ کو پسند آئے اور شگوفہ کی رونق بنے ۔ آپ کی صحت اور شگوفہ کی کامیابی کے لیے ہمیشہ دعا گو ۔۔

صابرہ بیگم ، ہبلی

محترم ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال صاحب

السلام علیکم

شگوفہ مارچ ۲۰۱۹ گذشتہ ہفتہ بذریعہ پوسٹ گھر کے پتہ پر موصول ہوا ۔ آپ کی کرم فرمائی کا شکریہ ۔ گوشۂ بانو سرتاج دیکھ کر مسرت ہوئی ۔ ماہنامہ شگوفہ کے مدیر یعنی آپ کو مرکزی وزیر ثقافت ڈاکٹر مہیش شرما کے دست مبارک سے ہندی بھون میں اردو کا قومی ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے تصویر دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی ۔ اس موقع پر ادارہ عکس ادب کی جانب سے دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں ۔

شگوفہ میں ' شگفتہ زار ' کی تفصیلات تصویروں کی زبانی ، اس ضمن میں ' وہ آئے بزم میں ' مفصل مضمون پڑھ کر آپ کے ہمراہ گزرے لمحات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے ۔ آپ سے مزید ملنے کی ابھی دل میں ہے ۔ دیکھیں خدا تعالیٰ کب ملاقات کرواتا ہے ۔

ڈاکٹر یوسف صابر

مدیر عکس ادب ، اورنگ آباد

فون 9326772575

اداریہ

پھر ملیں گے............

سعودی عرب کی سرزمین پر گذشتہ ۲۹ سال سے سماجی و فلاحی خدمات انجام دینے والی منفرد تنظیم بزم اتحاد جدہ نے ۱۲ اپریل ۲۰۱۹ ء کو ہوٹل ہالی ڈے ان جدہ میں شاندار ساتواں سالانہ جلسہ اور مشاعرہ منعقد کیا جس میں مدیر شگوفہ کو سالا رملت صلاح الدین اویسی ادبی انعام ۲۰۱۹ ء سے نوازا گیا۔صدر بزم جناب احمد الدین اویسی کے عطا کردہ اس انعام کی حرمت وعظمت اور اہمیت کی کئی سطحیں ہیں ۔میرے لیے یہ صرف دنیوی اعزاز ہی نہیں بلکہ مکہ و مدینہ کی مقدس فضاؤں میں ثواب دارین حاصل کرنے کی سعادت سے پھر ایک بار مشرف ہونے اور اپنا محاسبہ کرنے کا ایک زرین موقع عطا کیا گیا ، جسے میں نے اپنے تمام تر عجز وانکسار کے ساتھ مدینہ شریف میں برس ہا برس سے دعاؤں کے لیے شب و روز اٹھنے والے محترم احمد الدین اویسی کے دست مبارک سے حاصل کیا۔حسن اتفاق یہ ہے کہ یہ انعام جس معروف شخصیت یعنی محبی ومحترم صلاح الدین اویسی صاحب کے نام نامی سے معنون ہے شگوفہ ان کا پسندیدہ رسالہ بھی تھا۔ مجھے فخر ہے کہ کوئی پچاس سال کے طویل عرصے تک صلاح الدین اویسی صاحب سے میری رفاقت وخیر خواہی کا رشتہ استوار تھا۔صلاح الدین اویسی صاحب اردو زبان وادب کے بڑے عاشق تھے ۔۱۹۵۹ء سے دم آخر تک اردو زبان کی چھوٹی بڑی ریاستی اور کل ہند تحریکات کی سرگرمیوں پر ان کی گہری نظر تھی ۔تعلیم اور سرکاری امور میں اردو کے استعمال کے مسائل سے وہ خوب واقف تھے اور موثر نمائندگی کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے ۔شاید ۱۹۶۴ء میں لکھنو میں بہت بڑے پیمانے پر ایک سہ روزہ یادگار کل ہند اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں آندھرا پردیش سے صلاح الدین اویسی صاحب کے ساتھ چندر سری واستو اور میں نے شرکت کی تھی ۔سفر بذریعہ ٹرین ہوا۔اسی سفر کے بے تکلف ماحول اور لکھنو میں چار روزہ قیام کے دوران میں مختلف موضوعات پر محترم صلاح الدین اویسی صاحب سے بات چیت کا خوب موقع ملتا رہا۔محبت خلوص اور بے تکلفی کا یہ ماحول ہمیشہ قائم رہا۔محترم صلاح الدین اویسی نے آندھرا پردیش لینگویج بل کی منظوری ، مابعد پیدا ہونے والے مسائل ، اردو میڈیم جونیر کالج کے قیام ، ڈگری سطح پر اردو ذریعہ تعلیم کا تسلسل ، اردو اکیڈیمی کی تشکیل ، جیسے بے شمار مسائل پر کسی ذہنی تحفظ کے بغیر راست یا بالواسطہ موثر نمائندگی کی ۔ضرورت ہے کہ محترم سلطان صلاح الدین اویسی کی اردو خدمات کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے ۔میں صدر بزم جناب احمد الدین اویسی کا ممنون ہوں کہ سالا رملت سالانہ ایوارڈ ۲۰۱۹ ء مجھے عطا کیا گیا۔

اردو طنز ومزاح کے ارتقاء پر گہری نظر رکھنے والے محقق ،مورخ ونقاد ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے اپنا پی ایچ ڈی کا ضخیم مقالہ اردو نثر میں طنز ومزاح (تقسیم کے بعد) ۲۰۰۴ میں شایع کروایا تھا۔جس میں انہوں نے اولین خاکہ نگار کی حیثیت سے اور آپ بیتی کے آغاز کے ضمن میں فرحت اللہ بیگ کے کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔انہوں نے لکھا تھا کہ اردو میں خاکے کا ڈول مرزا فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۴ء تا ۱۹۴۷ء) نے ڈالا ۔اگر چہ ان سے پیشتر مولانا محمد حسین آزاد اس کا ناک نقشہ کافی حد تک تیار کر چکے تھے ۔ورک صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ 'اگر مرزا غالبؔ کے خطوط کا بہ غور مطالعہ کریں تو اس میں جتنا شاندار اور جان دار خاکہ خود مرزا کا تیار ہوتا ہے ۔اس کی مثال آج بھی اردو ادب میں ملنا محال ہے ۔اس لیے اگر ہم ذرا سی ہمت کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں خاکے کا سنگ بنیاد مرزا غالب ہی کے ہاتھوں رکھا گیا۔اب ۱۵ سال کے بعد اشفاق احمد ورک پوری ہمت اور تحریری شہادتوں کے ساتھ غالب کو اولین خاکہ نگار کے طور پر پیش کررہے ہیں ۔اس ضمن میں انہوں نے غالب کے خطوط سے ریزہ ریزہ یکجا کر کے بڑی عرق ریزی کے بعد غالب کی سرگذشت وحکایات کو مرتب کیا ہے ۔طرز غالب میں یہ ایک بیش بہا نثری سرمایہ ہے ۔جس کی اردو نثر میں کوئی مثال نہیں ملتی ۔ہم سراپا سپاس ہیں کہ اشفاق احمد صاحب نے شگوفہ کو اس لطف خاص سے ثروت مند کیا۔خاکہ نگاری کے آغاز پر گفتگو کے موقع پر فیاض احمد فیض اور نورالحسنین کے پروفیسر عبدالستار دلوی اور بشر نواز پر لکھے گئے تازہ خاکے بھی اس شمارے میں شامل کیے گئے ہیں نیز اس شمارے میں مشہور صحافی اور سعودی عرب میں روزنامہ سیاست کے نمائندہ خصوصی کے این واصف کی خاکہ نگاری پر بھی ایک خصوصی گوشہ شریک کیا گیا ہے ۔۔

معتمد عمومی بزم اتحاد جدہ کی رہائش گاہ پر دائیں سے بائیں جناب مہتاب قدر، جناب مسعود احساس،
جناب سردار اثر، جناب سید مصطفیٰ کمال، معتمد عمومی جناب یوسف امجد، جناب اطہر شکیل، جناب بدر الدین
کامل، جناب الطاف شہریار، جناب احمد رئیس نظامی اور جناب عبید بجھاو۔
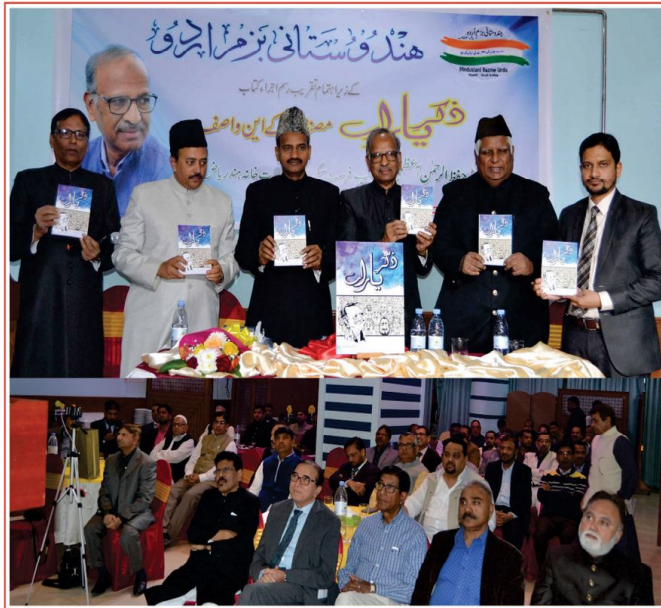
خاکہ نگار کے این واصف کی کتاب 'ذکر یاراں' کی جدہ میں رسم اجرا